
سلگتے چنار
—
زاہد مختار

محترم جاوید آذر

کی خدمت

میں

بصد خلوص

کہ انکی اپنائیت

آج بھی

میرے رگ و پے میں

سرائیت کر رہی ہے

زاہد مختار

۱۰ر جون ۲۰۰۵ء

سلگتے چنار

(شعری مجموعہ)

زاہد کے گاؤں کا جہلم اب بھی پانی پانی ہے
ہر قصّے کی زندہ کہانی جب بہہ جائے، تم آنا

زاہد مختار

المختار پبلی کیشنز

نئی بستی اسلام آباد (اننت ناگ) کشمیر

فون و فیکس 222192

☆ نام کتاب : ''سلگتے چنار''

☆ مصنف : زاہد مختار

☆ پہلا ایڈیشن : ۲۰۰۳ء

☆ کمپیوٹر کمپوزنگ : المختار کمپیوٹرز اننت ناگ کشمیر

☆ ناشر : المختار پبلی کیشنز، کشمیر

☆ قیمت : ایک سو روپے

☆ سرورق : عادل مختار

☆ چھاپ خانہ :

SULAGTAY CHINNAR

POETRY COLLECTION

BY

ZAHID MUKHTAR

ALMUKHTAR PUBLICATIONS

اِنتساب

بیٹی "حنا"

اور

بیٹے "عادلؔ" کے نام

میرے بچے کے تصور میں نہیں پریوں کا خواب

وہ وراثت میں میری اِک کہکشاں لے جائیگا

اُڑا کے ورق کتابوں سے داستاں لکھ دے
مجھے بھی اپنے زمانے کا بے زباں لکھ دے
نہیں ہے دل میں تیرے جب کوئی خیال شرر
میری نوشتِ مقدر میں پھر دھواں لکھ دے

یادوں کے فانوس

سبز پتوں پر سنہری دھوپ کے الفاظ تھے

بیتی شب کے اشک تھے یا صبح کے کچھ راز تھے



صحرائے دل میں بارہا سنگسار بھی ہوتے رہے
پھر بھی سلامت سر میرا، پتھر ترا اپنی جگہ

زاہد مختار

۱۹۸۶ء میں میری ایک شعری کاوش ''ابتدا'' جب منظر عام پر آئی تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ادبی حلقے کے ساتھ ساتھ ادب نواز دوستوں کے ایک وسیع دائرے میں بھی میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار پسندیدہ نظروں سے دیکھے جائینگے۔ فطرت کے تقاضوں کے تحت جب میں نے اپنے اشعار کو Quote ہوتے ہوئے دیکھا اور

اور سُنا تو مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ ادبی سرزمین میں اتنی زرخیزی ہے کہ یہ مجھ ادنیٰ سے قلمکار کی ادبی کونپل کو بھی ایک مہکتے پھول کا لبادہ عطا کر سکتی ہے۔ اس شعری مجموعے کے بعد بھی اگرچہ میں نے ادبی مشق جاری رکھی لیکن ''سلگتے چنار'' کی اشاعت کا کام غمِ روزگار اور غمِ دلفگار کے بیچ کہیں ناتمام حجت کے مراحل سے گذرتا رہا۔ اس دوران حالات و واقعات کا ایک لہولہو سمندر نگاہوں تلے بھی بہنے لگا اور اب کئی متعدد پُر پیچ راہوں سے گذرنے کے بعد میں اس مجموعے کو آپ کی محبت، شفقت اور توجہ کی طلب کے ساتھ منسہ الشھود پر لا رہا ہوں۔

میں ان صفحات میں اپنی شاعری کا نزول بیان نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ جان کر ان صفحات کو رقم رہا ہوں کہ ایک قلم کار کا اثاثہ صرف اُسکی ادبی کاوشیں ہی نہیں ہوتیں بلکہ اُس کی بھی اپنی ایک زندگی ہوتی ہے جسے وہ جینے کی سعی کرتا ہے۔

کبھی کبھار مجھے یوں بھی لگا کہ یا تو قدرت کے یہ کھیل نرالے ہیں کہ وہ ایک انسان کو حساس بنا کر اُسی کے سامنے اتنے لاتعداد حوادث لا کھڑا کرتا ہے کہ ہر بار اُسکے احساسات مجروح ہو جاتے ہیں اُس پر طرہ یہ کہ وہ اُسے ایک ایسی تڑپ کا اسیر بنا دیتا ہے کہ بات بتائے بنا رہا نہیں جاتا۔ یہی شاید میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے ورنہ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ نہ مجھے شاعری کی نزاکتوں کا ہی علم ہے اور نہ اس صنف کی باریک بینی کو سمجھنے کی کوئی بصیرت۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک قلمکار کی تیسری آنکھ بھی ہوتی ہے جس سے وہ گردشِ شام و سحر کو، زندگی کی تلخ و تند سچائیوں کو اور دل کی اتھاہ گہرائیوں کو مشاہدے کی نگاہ سے ''محسوس'' کر کے خونِ دل میں اپنی اُنگلیاں ڈبو کر رقم کرتا ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں کہ میں نے اپنے گرد و پیش میں ایسا کوئی قلمکار نہیں دیکھا جو جنون کی حد تک اپنے فن میں ڈوبا ہو۔ جسکے ہاں غیر شعوری طور پر پیدا ہونے والے الفاظ ہوں، جو اپنی تخلیقات میں یوں کھو گیا ہو کہ اُسے اپنی زندگی صحیح ڈھنگ سے

گذارنے کا شعور ہی نہ رہا ہو، میں نے ایسے بھی صاحبِ قلم دیکھے ہیں جن کے ہاں تیسری آنکھ تو درکنار چشمِ بینا بھی نہ تھی کہ اُنہیں اپنے اردگرد کی کسی غیر ادبی تصویر کا عکس نظر آتا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر بھی جھجک نہیں کہ میں نے اپنے مختصر سے ادبی دور میں ''ادبی حلقے'' کی وہ کرامات دیکھی ہیں کہ ذرّوں کو آفتاب بنا کر اُنہیں قوم کے سر پر تاحیات مُسلط کر دیا گیا۔

میں آج اپنے پُرخلوص قارین کے سامنے بنا کسی تیسری آنکھ کا دعویٰ کیے اپنی زندگی میں ہی اپنے تلخ تجربوں کا احاطہ کر کے اسے کتابی شکل دے رہا ہوں کہ اس زندگی کا سفر بلا شُبہ ایک ایسا سفر تھا جسکے ہر موڑ، ہر سنگ میل پر ایک لامتناہی درد کا سلسلہ تھا۔ ایک کشمکش تھی اور ایک اضطراب موجزن تھا۔ میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میری زندگی آئینے کی طرح صاف رہی ہے لیکن مجھے یہ احساس بھی ہے کہ میری زندگی میں میرے خیر خواہوں نے میری جس عادت کو تلخ مزاجی کا عنوان دیا ہے وہ میرا ردِّعمل تھا، میرا احتجاج تھا کیونکہ میں نے بچپن سے ہی اپنی زندگی میں ناانصافی کے وہ نظارے دیکھے ہیں کہ شاید اُنکے ہی ردِّعمل میں میرے قلم کو یہ قوت عطا ہوئی کہ میں نے کبھی نثر، کبھی نظم اور کبھی صحافت کے میدان میں اپنا لہو گرم رکھنے کا بہانہ تلاش کیا کیونکہ میرے اندر کا ''مختار'' مجھے کبھی بھی خاموش تماشائی بننے کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔

زندگی کے جس سفر پر خالقِ کائینات نے مجھے بھی ذرّوں کے کارواں میں شامل کیا تھا اُس سفر میں اگرچہ زندگی کی تمام تر رعنائیاں موجود نہ تھیں لیکن زندگی بے رنگ و بے نور بھی نہ تھی۔ بچپن کی سرحدوں میں جب میں نے انگڑائی لی تو یوں لگا کہ عالم اپنی تمام تر نوازشوں کے ساتھ بانہیں پھیلائے منتظر ہے لیکن دن گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک سراب دکھائی دیا۔ ایک دن ہمارا سب کچھ اُجڑ گیا۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب شفیق ماں کا ہاتھ تھامے رات کے ایک انجانے پہر میں والد صاحب کی رہنمائی میں ہمیں اپنے ہی گھر کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہنا پڑا صرف اس لئے کیونکہ میرے والد کو شہنشاہ سے گدّا بنا کر اُسے اپنا سارا اثاثہ بیچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور یوں جس کوچے میں بچپن کی مُسکراہٹیں اور کلکاریاں صدائے بازگشت کی طرح آواز دے

رہی تھیں اُسی کوچے کو میرے لئے ''آدم کی جنت'' کا عنواں عطا کیا گیا۔افسوس اس بات کا تھا کہ ہم نے کسی ''خوشہ گندم'' کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔میرے والد نہ صرف صوم وصلواۃ کے پابند تھے بلکہ میں نے ہمیشہ اُنہیں یادالٰہی میں ہی مشغول پایا تھا ——— خیر بہتر کی تمنا آنکھوں میں سمائے زندگی نے پہلی کروٹ لی حالانہ عالم ایسے بدلا تھا کہ کل جو ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھے آج دھول میں اٹے ہوئے اپنے لٹے کارواں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔عزم صمیم کا پیکر باپ اور صبر ایوب کی مثال ماں نے اپنے آغوش میں مجھے ،کن مصیبتوں اور آزمائشوں کے ساتھ پالا وہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن عمرِ رفتہ کے ساتھ میں نے اپنے اندر ایک نئے ''مختار'' کو انگڑائیاں لیتے ہوئے محسوس کیا۔وہ مختار کچھ کھلنڈرا تھا، کچھ فطرت کا شیدائی تھا اور کچھ آڑھی ترچھی لکیروں کے ساتھ کھیلنے کا بھی عادی تھا۔آٹھویں جماعت میں میرے ایک قابل اور محب اُستاد محترم سری کنٹھ (جو میرے ابتدائی اسکول ''مڈل اسکول نازک محلّہ'' کے ہیڈ ماسٹر تھے) نے اپنے چند اساتذہ کی مخالفت کے باوجود مجھے ایک اہم اور پُر وقار مقابلے میں اپنے سکول کی نمائندگی کرنے کا موقع دیا اور مجھے تلقین کی کہ میں اپنے اسکول کا نام روشن کر کے اپنے دیگر اساتذہ کو بھی اپنا ہمنوا بنادوں۔اور یہ اُس مخلص اُستاد کی ہی دعائیں تھیں کہ میں نے زندگی میں پہلی بار ایک سو روپے نقد اور ایک سند انعام میں حاصل کی اور یوں اسکے بعد میں ہر ثقافتی مقابلے میں نمائندگی کرتا رہا۔مڈل اسکول سے فارغ ہونے کے بعد مجھے اسلام آباد کے مشہور سکول ایم۔ایل، ہائیر سکنڈری سکول میں داخلہ ملا اور میں نے اپنے لئے میڈیکل سبجیکٹس کا انتخاب کیا حالانکہ اب مجھے اپنے آپ میں ایک ادبی ذوق وشوق رکھنے والے ذہن ودل کا احساس ہونے لگا تھا اور شائد اسی بات کو میرے اساتذہ کرام نے بھی محسوس کیا تھا اور میں آج اپنی ان محترم شخصیات کا ذکر کئے بنا نہیں رہ سکتا جنہوں نے میرے اندر بسے ''زاہد'' کو منصہ الشہود پہ لانے میں ایک اہم کردار عطا کیا۔اُن میں محترم محمد رمضان صاحب (اُردو کے اُستاد)، محترم چستی صاحب، (اُردو کے اُستاد) محترم مٹو صاحب (انگریزی کے اُستاد) اور محترم بنگرو صاحب (پرنسپل صاحب) کے علاوہ میرے والد جو

بذات خود ایک بلند پایہ عالم دین تھے اور جنہوں نے پچاس سال سے بھی زیادہ عرصے تک تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیا شامل ہیں۔ ان تمام صاحبان نے میری جو حوصلہ افزائی کی اُس کی بدولت ہی مجھے نویں جماعت کے ایک کشمیر سطح کے انٹر سکول **debate** میں امتیازی پوزیشن حاصل ہوئی اور یوں میرے اندر کے قلمکار کو فطری طور پر کچھ کرنے کا حوصلہ ملا۔

۱۹۷۳ء میں ہم حضرت بل اسلام آباد میں ایک کرایے کے مکان میں رہائش پزیر تھے۔ ہماری کم نصیبی کے دن اگرچہ اپنی تمازت کم کرنے لگے تھے لیکن گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے میں نے اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک میڈیکل شاپ بھی کھولی۔ ان ہی دنوں ڈگری کالج اسلام آباد میں میرا داخلہ بھی ہوگیا۔ اور میری یہ خواہش روز افزوں شدت اختیار کرتی جارہی تھی کہ میں اپنے والدین کو کم سے کم مدت میں پھر اُس مقام تک لے آوں جہاں اُنہیں کسی محرومی کا احساس نہ ہو لیکن ٹائپ، کتابت اور پینٹنگ کے فن کا قلیل فہم حاصل کرنے کے باوجود بھی زندگی کی گاڑی اُس پٹری پہ نہ آسکی جس سے وہ برسوں پہلے اُتر گئی تھی۔ ان ایام میں زندگی کی جو خاص اور انمول بات میرے مشاہدے میں آئی وہ میرے والدین کا عزم صمیم تھا۔ میں نے اپنے خوش مزاج باپ کو کبھی بھی زندگی سے ہارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن کے صبر و شکر کا پیمانہ کبھی بھی لبریز نہیں ہوا۔ وہ ہمیشہ اللہ کی رضامندی کا اظہار کرتے تھے اور انہی باتوں نے مجھے بھی زندگی سے لڑنے کا فن سکھا دیا۔ والد صاحب کے پاس چونکہ دینی علم کا کافی خزانہ موجود تھا اسلئے ظاہری طور پر مجھے بھی اُس سے استفادہ اُٹھانے کا موقع نصیب ہوا۔ اُن دنوں سرینگر سے شایع ہونیوالے ایک مقبول روزنامے ''زمیندار'' میں ایک ادبی صفحہ ہر جمعہ کو شایع ہوتا تھا۔ ہمارے والد صاحب چونکہ اخبار بینی کے عادی تھی اس لئے ہمیں گھر میں تقریباً سبھی اخبار روزانہ پڑھنے کو ملتے تھے۔ روزنامہ ''زمیندار'' کے ادبی صفحے کو دیکھ کر ایک دن میں نے بھی جھجکتے ہوئے اپنا ایک افسانہ ''چوٹ'' کے عنوان سے ایڈیٹر ''زمیندار'' کے نام ارسال کیا اور جب چند دنوں کے بعد میرا یہ مختصر سا افسانہ اس اخبار کے ''ادبی سیکشن'' میں شایع ہوا تو میری انبساط کی

کوئی حد نہ رہی۔ میں اسلام آباد کے سارے بازاروں سے یہ سوچ کر گذرا کہ کوئی تو میری ادبی صلاحیتوں سے واقف ہوا ہوگا لیکن جب کسی نے میری تخلیق کا ذکر ہی نہیں کیا اور جب میری اُمید کا چراغ بجھنے کے قریب تھا تب "سلیکشن ہاوس" نامی ایک دکان کے مالک اور ادب نواز محترم محمد شفیع مسگر صاحب نے مجھے آواز دے کر اپنی جانب متوجہ کیا اور پھر میرے افسانے پر نہ صرف اپنی پسندیدگی کا بلکہ حوصلہ افزائی کا بھی اظہار فرمایا۔ یہ شاید میرے ادبی سفر کی ابتداء تھی۔ ایک ایسے علاقے سے جہاں سے نہ کوئی اخبار شایع ہوتا تھا اور نہ ہی ادبی سرگرمیاں معرض وجود میں آتی تھیں۔ نہ جانے اب میری یہ خواہش کیوں پر لگا کے اڑنے لگی تھی کہ میں ایک وسیع آسمان میں اپنی ادبی کاوشوں کے پر پھیلاوں۔ ان دنوں میرے سر پہ فسٹ ایر میں اچھے نمبرات لے کر ڈاکٹری ٹرینگ کے لئے سلیکٹ ہونے کا بھی امتحان سوار تھا لیکن جب امتحانات ختم ہونے کے بعد نتایج سننے کا موقع آیا تو میرے چند اچھے ساتھی مجھ سے آگے نکل چکے تھے اور میں کامیابی کا وہ مزانہ لے سکا جس کی مجھے تمنا تھی۔ اسکے بعد میرے لئے کالج میں پڑھائی جاری رکھنے کا اگر چہ ایک ہی جواز تھا اور وہ یہ کہ مجھے کم از کم گریجویشن پوری کرنی تھی سو یہ ڈگری لینے کے ساتھ ساتھ میں نے شارٹ ہینڈ اور ٹایپ میں ایسی مہارت حاصل کی کہ مجھے گھر بیٹھے ہی ایک اچھی سرکاری نوکری ملی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ نوکری کا ایک نپا تلا سا شکنجہ میری طبیعت کے ساتھ میل نہیں کھاتا اور یوں میں نے اپنی آزاد دنیا میں ہی اپنے لئے اپنی راہیں چُن لیں۔ انہیں دنوں ہم نے اسلام آباد میں "رائیل تھیٹر" کے نام سے ایک ڈرامہ کلب معرض وجود میں لایا۔ چینی چوک کے ایک کرایے کے کمرے میں ہم چند دوست جن میں فردوس گل، رمضان نوشاد، راجندر، اسماعیل صدف اور دیگر کئی ایسے نوجوان فنکار تھے جن کی اپنی اپنی کوئی نہ کوئی ایسی خاصیت تھی کہ اُن کے ہی بل پر اس ڈرامہ تھیٹر نے ایک مختصر مدت میں پورے کشمیر میں ایک نام کمایا۔ فردوس گُل کی نفاست پسندی اور نظامت کا کوئی ثانی نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم نے سجود سیلانی کے لکھے کشمیری ڈرامہ "روپیہ رود" کو کشمیر کی سطح پر کھیلنے کی تیاریاں شروع کیں تو مجھے

اداکاری کے علاوہ اُس ڈرامہ کے پوسٹر ڈیزاین کرنے کا بھی کام سونپا گیا۔اُن دنوں آرٹسٹوں کی یہ عادت نہ جانے مجھ میں بھی کب سرائیت کرگئی تھی کہ میں پینٹنگ کے دوراں اپنے اطراف واکناف سے بے خبر ہو جاتا تھا اور اکثر مصوری کے عمل کے دوران مجھے اس بات کا بھی خیال نہ رہتا تھا کہ اردگرد رکھے رنگوں سے کبھی چٹائی تو کبھی میرے اپنے کپڑے خراب ہوتے تھے۔ ''روپیہ رود'' کے پوسٹر ڈیزائین کرنے کے دوران فردوس صاحب میرے پاس جب بھی آتے تو ایک پرچہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر میرے سامنے رکھتے تھے جس پر موٹے حروف میں یہ لکھا ہوتا تھا ''صفائی کا خاص خیال رکھیں'' اسماعیل صدف ہمارے تھیٹر کے ایک بہت ہی اچھے گلوکار تھے۔نہ جانے انہوں نے اپنے فن کو بعد میں کیوں محدود کر دیا۔ہمارے تھیٹر میں جو ایک اور شخصیت جو دلچسپی سے خالی نہ تھی رمضان نوشاد صاحب کی تھی ظاہری طور پہ سنجیدگی کے پیکر لیکن جب سٹیج پر آکر اپنی بے مثال کامیڈی کا مظاہرہ کرتے تھے تو ناظرین کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔مجھے اسلام آباد کے ٹاون ہال میں ایک ڈرامہ کے دوران اُنکی ایک ادا اب بھی یاد آکر زیر لب مُسکرانے پر مجبور کرتی ہے جب اُنہوں نے ایک ڈرامہ میں ایک عورت کا کردار ادا کیا تھا۔اُن دنوں اسلام آباد کے علاقے میں کوئی اداکارہ موجود نہ تھی جبکہ سرینگر میں کئی اداکاراؤں نے اپنے جلوے دکھانے شروع کیے تھے، خیر اُس ڈرامہ میں ایک منظر کے دوران اس اداکارہ کو اپنے خاوند کے ساتھ جھگڑا کرتے ہوئے ایک مٹی کا گھڑا توڑنے کی بھی اداکاری کرنی تھی لیکن عین موقعے پر ناظرین کے ساتھ ساتھ ہدایت کار اور ڈرامہ کے دیگر اداکار بھی یہ دیکھ کے ششدر رہ گئے کہ رمضان نوشاد صاحب نے عین سٹیج کے وسط میں سچ مچ ایک مٹی کا گھڑا ٹپک کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔مجھے یہ کہنے میں ذرا بھر بھی عار نہیں کہ اُن دنوں ہم ڈرامہ کی باریکیوں سے قدرے نابلد تھے لیکن جوں جوں جہلم میں پانی بہتا گیا ہمارے تھیٹر نے اپنے فنونِ لطیفہ میں نکھار پیدا کر دیا۔اور اُن ہی دنوں جب مجھے سجود صاحب کے ڈرامے میں ایک کردار ''روپیہ رود'' کے بعد ہمارے تھیٹر نے کئی اچھی کاوشیں منظر عام پہ لاکر داد تحسین حاصل کی۔میری زندگی میں وہ دن بھی کافی اہمیت کا

حامل تھا جب مجھے ایک کردار ''حکیم چھکل'' ادا کرنے پر بہترین اداکار کا انعام ملا مجھے چند دنوں تک ایسا لگا کہ میرے اندر ایک اداکار بھی چھپا ہے لیکن ''تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے'' کے مصداق میری اداکاری کا شوق دھیرے دھیرے مجبوریوں کے بادلوں تلے چھپ گیا اور مجھے زندگی کی ذمہ داریوں کے تیئیں کچھ اور سنجیدہ ہونا پڑا۔ مجھے ایک بار پھر سرکاری نوکری ملی۔ اور میں ''محکمہ واٹر ورکس'' میں ایک ٹائپسٹ کی حثیت سے تعینات ہوا۔ کچھ سال تک اس نوکری نے میری ذمہ داریوں کو کافی حد تک سہارا دیا لیکن ایکدن میرے آفیسر صاحب کا ایک گھریلو نوکر جو خیر سے ہمارے محکمے کے مسٹر رول پر تنخواہ حاصل کرتا تھا میرے پاس ایک سرٹیفکیٹ ٹائپ کرنے کے لئے آیا۔ اس وقت میرے ٹائپ رائٹر پر محکمے کا سالانہ پلان ٹائپ ہو رہا تھا۔ میں نے صاحب کے اس لاڈلے کو ایک گھنٹے کے بعد آنے کے لئے کہا لیکن یہ حضرت ٹلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، حد یہ کہ ان کا اندازِ تخاطب آفیسرانہ تھا۔ میں نے جب اس شخص سے ٹائپ ہو رہے کاغذ کی اہمیت بیان کرنی چاہی تو اُس نے اپنے ہاتھ میں تھامی میٹرکولیشن سرٹیفکیٹ کی اہم ترین نوعیت یہ کہتے ہوئے بیان کی کہ یہ سرٹیفکیٹ آفیسر صاحب کی محترمہ کی ہے اور یہ اُن ہی محترمہ کا حکم ہے کہ اسے دومنٹ میں ٹائپ کیا جائے۔ بس اتنا سننا تھا کہ میرے اندر کا ردِ عمل ایک احتجاج بن کر سامنے آیا اور میں نے اُس کام کو نہ کرنے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ وہ حضرت اُس وقت میرے تیور دیکھ کر نو دو گیارہ ہو گئے لیکن دوسرے دن جب میں نے اپنے آفس کے کمرے میں قدم رکھا تو سب سے پہلے جس شخص کا میں نے منہ دیکھا وہ صاحب کا اردلی تھا یہ آرڈر لے کر کہ صاحب مجھے یاد کر رہا ہے۔ صاحب کے تیور گرم تھے یا اُن کے تیوروں کو ''گرما گرم'' کر دیا گیا تھا۔ نتیجہ میرے ہاتھ میں ٹرانسفر آرڈر تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس ٹرانسفر آرڈر کو اپنے اوپر لاگو کر دیتا میں نے اُس نوکری کے بندھنوں سے ہی اپنے آپ کو آزاد کر دیا۔

ان دنوں ہم نئی بستی اسلام آباد منتقل ہو چکے تھے اور ہم نے اپنے ایک چھوٹے سے مکان کی سنگ بنیاد بھی ڈال دی تھی اور یوں میں اُس مکان کی تعمیر کی ذمہ داریوں میں مصروف

ہو گیا۔۔ مجھے وہ دن اب بھی یاد ہے جب دس سال کے طویل عرصے کے بعد ہم نے اپنے مکان کی چھت مکمل کر لی تھی اور کمروں میں پلسٹر کیا تھا، ابھی یہ پلستر گیلا ہی تھا لیکن ہماری ماں نے ان کمروں میں دس محرم الحرام کی شب کو ڈھیرا جما کے پہلی بار ایک سکون کا سانس لیا۔ مجھے اپنی ماں کے وہ الفاظ اب بھی کہیں آس پاس سنائی دیتے ہیں جب اُس نے اس گھر کے چھوٹے سے رسوئی کے کمرے میں ہمارے لئے کھانا پروس کر یہ کہا تھا'' آج تک خدا نے ہمیں بھوکا تو نہیں رکھا لیکن آج دس سال کے بعد مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے گھر میں سب کو کھانا کھلا رہی ہوں۔''

اس کے بعد میری زندگی میں ایک واضح تبدیلی یہ آئی کہ میں نے زندگی کی اُن بے دردیوں کا احساس کی حد تک مشاہدہ کیا اور مجھے لگا کی یہ دنیا جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ میں نے نوکری سے استعفی دینے کے بعد نصرت مارکیٹ کے ایک خوبصورت اور مصروف بازار میں اپنی میڈیکل دکان نئے اور بہتر طریقے سے قایم کی تھی اور یوں زندگی کے ایام کچھ کم جان لیوا ثابت ہونے لگے تھے۔ ان دنوں میرا رابطہ کشمیر کے نوجوان ادبی حلقے سے قایم ہو گیا تھا۔ اُن دنوں میں شاعری کی بجائے افسانہ نویسی کی جانب زیادہ راغب تھا۔ اسلام آباد کے قلمکاروں کی ادبی نشستیں میرے غریب خانے پر اکثر بیشتر منعقد ہونے لگی تھیں۔ اُن دنوں جو قلم کار میرے علاقے میں سرگرمِ عمل تھے اُن میں قاسم سجاد شاعری اور صحافت کے میدان میں اپنے گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھے۔ مجھے ''چراغ آرزو'' اخبار میں اُن کے بے باک ادارے کافی اچھے لگتے تھے۔ ''محفل فکر وسخن'' میں شوریدہ صاحب (مرحوم)، کاشی ناتھ باغوان، اقبال فہیم، ایوب صابر، محمد منور خادم (مرحوم)، محمد یوسف نیرنگ، ثناء اللہ میر، محمد شفیع مہر، منیر احمد شال، بشیر اندرابی، پیاری لال سودیشی، صوفی شمیم، مظفر حسین عطار، غلام محمد آشتی، خالد ثناء اللہ، نور نسیم، شکیل الرحمان جیسے ادیب اور ادب نواز شامل تھے۔ اس ادبی تنظیم کی منعقد کردہ محفلوں میں عطا محمد میر جیسے شریف النفس ادیب کا بھی ایک اہم رول رہتا تھا۔ میر صاحب کی ایک خاصیت

مجھے آج بھی زندگی کا ایک حسین رنگ سمجھا دیتی ہے وہ یہ کہ میر صاحب کو جب بھی کسی شخص یا بات سے اختلاف ہوتا تو وہ اس کا ردِّ عمل محفل میں خاموش رہ کر کرتے لیکن گھر جا کے صفحہ قرطاس پہ اُس شخص یا اُس بات کے خلاف ایک لمبا چوڑا مضمون قلم بند کرتے تھے۔ اور جب تک وہ مضمون اپنے اختتام کو پہونچتا تھا میر صاحب کا سارا اختلاف، ساری رنجشیں دور ہو جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں غلام نبی ناظر صاحب بھی ہماری حوصلہ افزائی کے لئے شریک ہوتے تھے۔ ہمیں اُن کی مترنم غزلیں سننے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ہماری محفل میں اُن دنوں بشیر دادؔا کا بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ وہ اپنی سیر حاصل بحث سے ہمیں کافی محضوظ کیا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ اخبار ''آفتاب'' میں میری اور اُنکی ادبی جنگ کافی عرصے تک قایم رہی اور مجھے اُن کے ایک دست راست محی الدین صاحب مانی گام کا بھی نام یاد آتا ہے جنہوں نے اس سرد جنگ کے دوراں اُن کا کافی ساتھ دیا۔ بہر حال دو قلمکاروں کی یہ دلچسپ نوک جونک ایکدن میری ہی دکان پہ اسطرح ختم ہوگئی کہ ہم دونوں نے ایک مشترکہ غزل قلمبند کی جسکا ایک مصرعہ دادؔا صاحب نے لکھا اور دوسرا میں نے۔ اس مجموعے میں میں نے وہ غزل بھی شاملِ اشاعت کی ہے ان ادبی محفلوں میں ۱۹۸۰ء کے وسط میں مقبول وی رے، راجہ یوسف، ظفر فاروق صلاتی، قیصر بودا اور عرفانی سجاد بھی شامل ہوئے اور یوں یہ کارواں بڑھتا گیا۔ ان ادبی محفلوں میں شرکت کے ساتھ ساتھ میری تخلیقات مختلف اخباروں میں بھی شایع ہوتی رہیں جن میں اخبار ''آفتاب'' کا ایک اہم حصہ رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ کشمیر کے اکثر ادیبوں کو متعارف کرانے میں اس اخبار کا جو رول رہا ہے وہ سنہری لفظوں میں لکھنے کے قابل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اِس اخبار کا ایک ''ادبی صفحہ' ہر ہفتے شایع ہوتا تھا جسکے انچارج کشمیر کے ایک نامور افسانہ نویس عمؔر مجید صاحب تھے۔ ان ہی ایام میں میرا رابطہ سرینگر اور کشمیر کے دیگر اضلاع کے نوجوان قلمکاروں سے بھی قایم ہوگیا۔ ہم اکثر ایک دوسرے کو دلچسپ خطوط لکھا کرتے تھے۔ مجھے اس ضمن میں عمر مجید صاحب کے خطوط نہ صرف محبت اور شفقت سے لبریز محسوس ہوتے تھے بلکہ میں نے

اُن کے نوازش ناموں میں ہمیشہ ایک حوصلہ افزائی کی کرن پائی۔ الطاف ناد پوری صاحب اُن دنوں اپنا بازار سرینگر میں زیر ملازمت تھے۔اُن کی ایک اچھی عادت تھی۔ وہ ہر کسی کے ساتھ قلمی رابطہ قایم رکھتے تھے ۔ میری چند تخلیقات کو پڑھنے کے بعد اُنہوں نے مجھے بھی اپنی نوازشوں میں شامل کر دیا اور یوں جب میں اُن کے پاس سرینگر کے اپنا بازار کمپلیکس میں پہنچا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اُن کی وساطت سے میری ملاقات مشتاق مہدی، سید یعقوب دلکش، مجروح پوربی، ایس، ایم قمر۔غلام نبی شاہد، جاوید آزر، فاروق آفاق، اشرف آثاری، ریاض معصوم قریشی، میر نوشاد رسول، قطب الدین قطب، مرحوم ریاض ماہر، فرید پربتی، رشید راہی سے ہوئی میرے افسانوں کی وجہ سے تالاب تلو جموں میں اُن دنوں رہایش پزیر محترم ویریندر پٹواری کے حوصلہ افزا خطوط بھی میری ادبی زندگی کا اہم اثاثہ بنا اور جب انفارمیشن محکمے کے ''تعمیر'' میں میرے مختصر افسانے شایع ہونے لگے تو میرا ادبی حلقہ کچھ اور وسیع ہوگیا۔ اُن دنوں ''تعمیر'' کی ادارت کے فرایض مرحوم بابا صاحب انجام دیا کرتے تھے۔ بابا صاحب میرے افسانوں کو ہمیشہ پسند فرمایا کرتے تھے، اُن کے ہاں کئی ادبی شخصیات تشریف آور ہوتی تھیں اور یوں میں نے اپنے ابتدائی ادبی رجحان سے جن مصنفین کو رسالوں اور اخباروں میں پڑھا تھا اُن سے بھی ہمکلام ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان اشخاص میں مجھے حامدؔی کاشمیری صاحب کی دلآویز اور ملنسار شخصیت نے کافی متاثر کیا جو نوجوان ادیبوں کے تئیں ہمیشہ ایک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس دوران میری ملاقات خالدؔ بشیر صاحب سے بھی ہوئی جن کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کی وہ نہایت ہی ریزرو قسم کے آدمی ہیں۔لیکن جوں جوں میری اُن کے ساتھ قربت بڑھنے لگی اتنا ہی مجھے اُنمیں ایک سنجیدہ اور ملنسار شخص نظر آنے لگے۔ مجھے اُن کی ''غالب سے چھیڑ چھاڑ'' بہت اچھی لگتی تھی جس میں وہ غالب مرحوم کے ایلکے ایک مصرعے کو اپنی شاعری کے فن سے کافی دلنشیں قطعہ بنا دیتے تھے۔ انفارمیشن محکمے میں ہی مجھے قاضی صاحب، محی الدین صاحب (جو آج کل کشمیری رسالہ ''آلو'' کے مدیر ہیں) اور فن خطاطی میں میرے اُستاد محترم بشیر احمد سے ملنے کی سعادت

نصیب ہوئی۔ بشیر صاحب کی دلچسپ شخصیت نے مجھے عرصہ دراز تک اپنا گرویدہ بنا دیا لیکن پھر اُن کے ہاں آنا جانا کم ہوا اور یوں زندگی کی دیگر مصروفیات نے ہماری بلا ناغہ ملاقاتوں پر قدغن لگا دی۔ اس دفتر کے ادبی ماحول نے کافی حد تک میرے ادبی رجحان کو تقویت عطا کی ۔ یہاں پہ محترمہ روما دوانی۔ محترمہ شاہدہ مصطفےٰ محترم فاروق رینزو، سجاد حسین، شبنم قیوم، امداد ساقی اور دیگر کئی ایسی شخصیتوں سے مل بیٹھنے کا اتفاق ہوا اور یوں کاروانِ ادب سے میرا سلسلہ جڑتا گیا۔ رینزو صاحب نے بعد میں مجھے ''آل انڈیا اردو ہندی سنگم'' کی اننت ناگ شاخ کا کنوینر بھی نامزد کیا حالانکہ اس سنگم نے وادی کے اندر کوئی خاص ادبی معرکہ سر نہیں کیا لیکن رینزو صاحب آج بھی میرے اچھے دوستوں میں شامل ہیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب قلم کار کے قلم میں احساس درد اور دل میں اپنے ہم عصر ادیبوں کے تئیں محبت اور شفقت تھی ۔ ہم ستائیس روپے کے عوض ریڈیو کشمیر کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں پر ہمیں محترم کے۔کے۔ نیر، محترم بشیر شاہ محترم سجاد رضوی، محترم عبید صدیقی اور دیگر ایسی کئی ادبی شخصیتوں کی شفقت اور حوصلہ افزائی ملتی تھی ۔ ریڈیو کشمیر میں ہمیں ادب اور ادبی دنیا کی وہ تصویر دیکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم ہوتا تھا جس کا کینواس ایشیا کے ادبی اُفق پر محیط تھا اس دوران میں نے اکثر افراد جو اتفاق سے ادیبوں کے ہی زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں کی یہ بات نوٹ کی کہ وہ خود اردو ادب سے وابستہ تھے یا تھے لیکن اکثر نوجوان قلم کاروں کو یہ کہہ کر احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اردو ادب کشمیری نوجوان کے بس کی بات نہیں حالانکہ بعد میں اُن کا یہ خیال خام ہی ثابت ہوا کیونکہ اب کشمیر کا اردو ادب ایشیا کے حلقہ ادب سے آنکھ ملانے کی جرأت کرتا ہے لیکن آج بھی یہ ''سخن ورانِ کشمیر'' چند سربراہوں کے دفاتر میں قہوے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے صرف خود کو ہی اصلی ادیب گردانتے ہیں۔ اب تو ریڈیو کے اندر اجارہ داری کے نظارے زیادہ نظر آتے ہیں تب دور گاؤں میں رہنے والے ادیبوں کو بھی اس سٹیشن سے اپنی ادبی پیاس بجھانے کا موقع فراہم ہوتا تھا۔ اب تو یہ عالم ہے کہ اماں پروستی ہے اور لاڈلے کھاتے ہیں اور حد یہ کہ دروازے

پر پہرے دار بھی اب زیادہ مستعدی سے براجمان ہیں۔ بہر حال اس اسٹیشن کی وساطت سے کافی شعرا اور ڈرامہ نویس منصہ الشہود پہ آئے۔ ابتدا میں ہم اس اسٹیشن سے نوجوانوں کے لئے رکھے گئے مخصوص پروگرام میں شرکت کیا کرتے تھے لیکن بعد میں جب ''یواوانی سروس'' شروع کی گئی تو کشمیر کے ادبی حلقے میں چند نئے ناموں کا اضافہ ہوا اور یہاں کے ادبی اُفق پر مرد حضرات کے علاوہ چند خواتین قلمکاروں کا کارواں بھی رواں دواں نظر آنے لگا جن میں واجدہ تبسم، مبین الخلیل، شہزادی روبینہ شاہین (جواب میری شریک حیات ہے) پروین اختر، نیلوفر جبین، صبا، محبوبہ وانی، سیدہ نصرین نقاش، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انکے علاوہ رخسانہ جبیں اور اظہر نعیمہ احمد نے ادبی حلقے میں ایک نام کمایا تھا۔ نعیمہ جی کو میں نے پہلی بار کلچرل اکادمی کے 'محفل افسانہ' میں سُنا یہ ایک تنقیدی محفل تھی اور اس میں اور قلمکاروں کے علاوہ نوجوان قلمکار مرحوم انیس ہمدانی بھی موجود تھے جن کی موت ایک عظیم سانحے سے کم نہ تھی۔ اُن دنوں میں اسلام آباد سے ایک ادبی رسالہ ''لفظ لفظ'' نکالنے کا ارادہ کر رہا تھا اور میں نے اس سلسلے میں ریاستی سطح کے تمام قلمکاروں کو خطوط ارسال کئے تھے۔ اُن دنوں سرینگر کے ایجوکیشن کالج میں ایک مشاعرے کے دوران میری ملاقات رخسانہ جی سے ہوئی۔ اُنہیں میرے خط کی خوش خط تحریر نے کافی متاثر کیا تھا اور انہوں نے ''لفظ لفظ'' کے لئے نہ صرف دو غزلیں بلکہ میری خوش خط تحریر کی پسندیدگی کے جواب میں ایک خط بھی تحریر کیا تھا اور وہ پوسٹ کرنے کے لئے اُن کے پاس موجود بھی تھا۔ بہر حال اس شفیق اور باصلاحیت قلمکارہ سے ملاقات میرے لئے باعث اعجاز ثابت ہوئی۔ بعد میں رخسانہ جی کے ساتھ ہم نے ریڈیو کی وساطت سے کافی اچھے اور پُر مغز پروگرام ترتیب دیئے اور آج بھی ادبی حوالے سے یہ سلسلہ قایم ہے۔ رخسانہ جی کی تحریروں میں جتنی تازگی، متانت اور سنجیدگی موجود ہے اُتنی ہی اُن کی شخصیت میں یہ اوصاف بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ اس ادارے کے جریدے ''آواز'' نے میری شاعری کو بیرونِ ریاست کے محبّ قاری دیئے۔ ریڈیو کشمیر میں ہی جس خوش مزاج قلمکار سے ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹر رفیق مسعودی ہیں (جو آجکل ریڈیو کشمیر سرینگر کے ڈائریکٹر ہیں) ان کی زیرِ سرپرستی میرا ایک

تحریر کردہ ڈرامہ ''سفر برزمین ہُند'' آل انڈیا یووانی ڈرامہ فیسٹول کے لئے تیار کیا گیا۔ اس ڈرامہ میں میرے ساتھ ساتھ جن فنکاروں نے شمولیت کی اُن میں بھارتی زارو، جیوتی کو مشتاق علی، اور مدثر نحوی کے نام قبل ذکر ہیں۔ اس ڈرامہ کو **letter of appreciation** سے نوازا گیا۔ ریڈیو سے ہی وابستہ محترم بشیر عارف کے ساتھ میری ادبی زندگی کے کچھ اچھے دن یادگار ثابت ہوئے ہیں۔ ایکبار اُنہوں نے ریڈیو کشمیر کیلئے ایک مشاعرہ کشمیر یونیورسٹی میں منعقد کیا۔ مجھے وہ لمحہ آج بھی یاد ہے جب وہاں پر کچھ اچھے شاعروں کو نوجوان ناظرین کے سامنے خفت اُٹھانی پڑی کیونکہ وہاں پہ اُنہوں نے اپنی علامتی اور ابہام سے بھرپور شاعری سنانے کی کوشش کی تھی۔

ان دنوں میں نے ''لفظ لفظ'' نکالنا شروع کیا تھا۔ ''لفظ لفظ'' کو اگرچہ اردو ادبی حلقے میں کافی پزیرائی ملی لیکن اس رسالے کو باقاعدہ ''ڈیکلریشن'' نہ ملنے کے سبب کچھ شماروں کے بعد ہی بند کرنا پڑا۔ اس رسالے کو منیر سیفی، خوشتر گرامی، فضا ابن فیضی، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ویریندر پٹواری، مظہر امام، حامدی کاشمیری، شمس الدین شمیم اور دیگر کئی کہنہ مشق قلمکاروں کی قلمی معاونت حاصل رہی۔ اس رسالے کو کامیاب اور مقبول عام بنانے میں میرے ایک محب اور ادب نواز ساتھی خورشید احمد دین کا پُر خلوص ساتھ رہا۔ جبکہ اس رسالے کی نایب مدیر روبینہ شاہین تھی۔ اس رسالے کو ڈیکلریشن نہ ملنے کی وجہ سے کچھ مدت تک میرا دل کافی اُداس رہا اور میں نے اس سلسلے میں ماہنامہ تکبیر کی وساطت سے کئی تلخ کالم بھی لکھے۔ ''ماہنامہ تکبیر'' میں جن محسنوں کے ساتھ مجھے کام کرنے میں بے انتہا مسرت ہوتی تھی اُن میں جوہر قدوسی، ش۔م۔احمد، پیر عبدالشکور، احمد علی فیاض، محمد طارق الاسلام اور مسعود حسین کا نام قابل ذکر ہے صحافت کے ہی میدان میں مجھے مرحوم محمد شعبان وکیل (الصفا) طاہر محی الدین (چٹان) فیاض کلو اور ظہیر الدین (گریٹر کشمیر) محمد الطاف، یوسف جمیل (بی بی سی) ظفر معراج (کشمیر مانیٹر) بشیر احمد بشیر (سرینگر ٹائیمز) عبدالرشید (ندائے مشرق) معرفت قادری (آفاق) ظہور احمد (محبوبیہ پریس) محترم قریشی

(خدمت پریس) اور میرے صحافی دوست مختار احمد کی محبتیں اور عنایتیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔

ان ہی ایام کے دوران میرے اندر کے ''زاہد'' کو بھی محبتوں کے ایک دریا سے گزرنا پڑا۔ انفارمیشن محکمے کی مقامی شاخ نے اسلام آباد کے وومنز کالج میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا اور مجھے اس مشاعرے کی نظامت کے فرایض انجام دینے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ مخصوص دن پر ایک اچھی خاصی اور ڈسپلنڈ آرڈینیس کے سامنے میں نے ایک مختلف انداز سے مشاعرے کا آغاز کیا۔ میں ہر شاعر کے بعد موجود سامعین کو ایک نہ ایک لطیفہ سُنا کر محفل کو لالہ زار بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر کافی اچنبھا ہو رہا تھا کہ بظاہر ایک شریر سی لڑکی ایک کونے میں اپنی لکچرارس کے درمیان بیٹھی کافی سنجیدگی کے ساتھ مشاعرے میں محو تھی لیکن میرے کسی بھی لطیفے پر اُس نے ایک ذرا سا تبسم بکھیرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی حالانکہ بعد میں یہ لڑکی میری زندگی کے تقریباً آٹھ برسوں تک ایک حسین جذبے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہی اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ میری زندگی سے الگ بھی ہوئی۔ ان دنوں کی یادیں بھولی بسری کہانی کی طرح کبھی شعروں میں آتی بھی ہیں تو اُسے ایک شاعر کی زندگی کا ایک خواب سمجھ کر اپنی ایک حقیقی زندگی کا احساس لئے ایک باپ، ایک شوہر اور ایک شہری کی زندگی جینے کی سعی کر رہا ہوں۔ اسی مشاعرے میں میری ملاقات مشہور گلوکارہ کیلاش مہرہ جی سے ہوئی جن کی شفقت آج بھی میرے ساتھ قایم ہے۔ انہوں نے میری چند غزلوں کو اپنے فن سے جلا بھی بخشی ہے۔

کشمیر میں اس دوران جب دوردرشن نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تب میں نے بھی اس ادارے کے ذریعے کافی ادبی کاوشیں منظر عام پہ لائیں۔ ابتدا میں دوردرشن کے مقامی چینل پر کسی بھی اداکار یا میزبان کو دیکھ کر لوگ اُسے بیچ بازار میں اپنی محبت اور پسندیدگی کا مرکز بناتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس سنٹر کا معیار اور اسکی دلچسپی کا گراف گرنے لگا، اس ادارے کے مقامی کیندر میں جب ہم نے قدم رکھا تھا تب لاکھوں کے سودے نہیں ہوتے تھے۔ ایک مصنف، ایک اداکار، ایک ہدایت کار، ایک پیش کار اور ایک اداکارہ کا اپنا ایک رتبہ تھا

پہچان تھی۔ ہر پروڈیوسر اپنی جگہ ایک سے بڑھ کر ایک پروگرام ترتیب دینے میں مصروف ہوتا تھا آج بھی مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ مجھے دوردرشن کے ایک چھوٹے سے سکرین پر جس پروڈیوسر نے صرف ایک پروگرام کی وساطت سے وسیع ادبی حلقے میں متعارف کرایا وہ محترم بشیر بڈگامی تھے۔۔ بشیر صاحب نے مجھے ایک گھنٹے کے ایک پُر وقار مشاعرے میں جس میں وادی کے تقریباً سبھی نامور شاعر مدعو تھے نظامت کے فرایض انجام دینے کی ذمہ داری سونپی اور اللہ کا فضل شاملِ حال رہا اور میں نے اُنہیں مایوس نہیں کیا۔ یہ پروگرام جب ٹیلی کاسٹ ہوا تو دوسرے دن سے مجھے ایسا لگا جیسے میں پلک جھپکتے ہی ایک انجانی دنیا سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہوں جہاں ہر ایک کو میری شاعری اور میرے پروگرام پیش کرنے کے فن سے ایک انجانا لگاؤ ہو گیا ہو۔ اسکے بعد میرے فن کو جلا عطا کرنے میں جن ماہر ہاتھوں نے مجھے اس میڈیا کی باریکیوں سے روشناس کرایا اُن میں محترم مظہر امام،، اشوک جیلخانی، جے کشن زتشی، مرحوم ظفر احمد، زاہد منظور، شبیر مجاہد، راجیش کول،، بنسی کول، جان میکس لوبو، کیمرہ مین اسٹینلے، سوہن لال کول گلریز قریشی، اور ایسی کئی محترم شخصیات کا نام قابل ذکر ہے۔ اسی ادارے میں مجھے آفاق احمد سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جن کے ساتھ میں نے کافی اچھے دن گزارے ہیں۔ اُن کے گھر میں ہم نے کئی یادگار ادبی نشستیں کیں۔ ستالیس سال سے اس میڈیا کے ساتھ وابستہ ہونے کے دوران چند دلچسپ یادیں بھی دامن دل کے ساتھ جُڑی ہیں ان میں زاہد منظور صاحب کے طفیل میرا بمبئی کی فلم انڈسٹری جانے کا بھی اتفاق شامل تھا۔ ہوا یہ کہ زاہد صاحب نے دوردرشن کے لئے لکھی گئی میری پہلی فلم ''صبا'' بنا کر مجھے اسکرین پلے رائٹرس کی صف میں شامل ہونے کا موقع فراہم کیا تھا اور ان ہی دنوں بمبئی فلم انڈسٹری کے مشہور ڈائریکٹر پرکاش مہرا، امیتابھ بچن کے ساتھ وارد کشمیر ہوئے تھے۔ اُن دنوں امیتابھ جی کے پرسنل سکریٹری شیتل جین صاحب تھے جن کے مراسم زاہد منظور صاحب کے ساتھ بڑے قریبی تھے۔ ایکدن اُنہوں نے منظور صاحب سے اُن کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا اور زاہد صاحب نے اُنہیں اپنی دو فلمیں، میری

تحریر کردہ ''صبا'' اور منظور خان کی لکھی ''پتھر کے لوگ'' دکھائی ۔ جین صاحب نے ''صبا'' کے اسکرپٹ کی تعریف کی اور یوں منظور صاحب نے مجھے نہ صرف جین صاحب سے متعارف کرایا بلکہ ایک سفارشی خط دے کر بمبئ جانے کا بھی مشورہ دیا۔ بمبئ جاتے ہوئے ٹرین میں میری ملاقات کشمیر کے ہی ایک فنکار لطیف بھنی سے ہوئی (جنہوں نے حال ہی میں ایک فیچر فلم ''ہم پنچھی ایک ڈال کے'' ڈائیریکٹ کی ہے) لطیف بھائی کے ساتھ میری ملاقاتیں دوردرشن میں ہوتی رہتی تھیں اور اب وہ اپنی قسمت آزمائی کے لئے بمبئ میں رہائش پزیر تھے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بمبئ میں baculla bridge کے پاس واقع شیوناری بلڈنگ میں لے گئے جہاں وہ اپنے ایک دوست محمد اشرف (بارہمولہ) کے ساتھ رہتے تھے۔ میں نے بمبئ میں ان دونوں ملنسار ور محنتی دوستوں کے ساتھ بہت اچھے دن گزارے اور اس دوراں شیتل جی نے مجھے فلم انڈسٹری کی کچھ اہم شخصیتوں سے بھی ملایا۔ شیتل جی کی بیوی اتنی شفیق ثابت ہوئی کہ اُنہوں نے مجھے پہلے ہی دن اپنے گھر میں ٹھہرنے کی بے لوث دعوت دی لیکن میں چونکہ اپنے مخلص دوستوں کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا اور یوں ہم تینوں بہت دنوں تک باہمی طور اخراجات کی ذمہ داریاں اُٹھاتے ہوئے ساتھ ساتھ رہے۔ لطیف اور اشرف بھائی اپنی جدوجہد کے مراحل سے گزرتے رہے اور مجھے چند اچھی فلمی ہستیوں کے ساتھ کام کرنے کے باوجود بمبئ کی فلم انڈسٹری کا روکھا، روایتی اور مشینی انداز راس نہ آیا اور میں چند اچھی بُری یادیں لیکر اُس دنیا سے لوٹ آیا۔ میری واپسی میں میرے والدین کی اُس شفقت کا بھی ہاتھ تھا جو مجھے اپنے سے دور رکھنے کا صدمہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور میرے لئے بمبئ کی خشک فلمی دنیا سے بڑھ کر ماں کی وہ آغوش تھی جسنے مجھے زمانے کے خشک وتر سے بچانے کا جتن کیا تھا۔

انہی دنوں میں نے کشمیر آکر صحافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور چند خیر خواہوں کے طفیل ہفت روزہ ''المختار'' کی ڈیکلریشن حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ اُن خیر خواہوں اور دوستوں میں اُس وقت کے ڈی سی علی محمد میر صاحب۔ نوجواں اور ادب نواز پولیس آفیسر عبدالقیوم منہاس

قابل ذکر ہیں۔ منہاس صاحب نے تو باقاعدہ میری اُس وقت تک کی تمام شاعری کو مجھ سے خوش خط لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا اور دس سال کے ایک لمبے عرصے کے بعد جب اُن سے میری ملاقات ایک شوٹنگ کے دوران بٹوت میں ہوئی تو وہ مجھے اپنے ہاں رام بن لے گئے۔ ان دنوں وہ ایس پی ٹریفک نیشنل ہائی وے تھے اور مجھے یہ دیکھ کر کافی حیرت اور مسرت ہوئی کہ دس سال کے بعد بھی میری شاعری کا قلمی نسخہ اُن کے پاس اُسی محبت کے ساتھ موجود تھا اور اُنہوں نے اپنی پوسٹنگ کے دوراں کبھی بھی اسے اپنے سے الگ نہیں رکھا تھا بہرحال اخبار ''المختار'' کے ابتدائی دنوں میں میں اخبار کی کتابت سے لیکر ادارت تک کے فرائض خود انجام دیتا تھا لیکن بعد میں جب اس کی سرکولیشن نے ''کشمیر نمبر'' کے بعد ایک مقبولیت کی حد پار کی تو اس سلسلے میں مجھے شہر سرینگر میں بھی اسکا بیورو آفس کھولنا پڑا۔ اس اخبار کو ہر گھر کا پسندیدہ اخبار بنانے میں جہاں میرے منیجر صاحبان مسعود احمد کنٹھ اور محمد مرتضیٰ شاہ کا رول کافی اہم رہا، وہاں میرے اچھے قلم کار دوست بشیر منظرؔ نے بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔۔ اس اخبار سے وابستہ ہونے کے بعد اگرچہ میرا رابطہ دیگر ادبی سرگرمیوں سے منقطع ہو گیا لیکن اس دوران ادبی اُفق پر بھی ایک جمود طاری ہو گیا تھا ، جس کی ایک عیاں وجہ کشمیر کی موجودہ صورتحال تھی۔ اس دوراں اکثر ادباء خاموش ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ایک لہولہو سمندر بہنے لگا تھا اور زندگی کے سامنے لاکھوں موضوعات پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ ان دنوں کشمیر میں عسکری تحریک کی ابتدا ہو چکی تھی اور صحافت کے پیشے وابستہ ہونا ایک کاردار دوالا معاملہ بن چکا تھا۔ اس دوران اگرچہ وادی کے قلم خاموش نہیں تھے کیونکہ جب کسی ادیب سے ملاقات ہوتی تھی تو وہ درد والم کی اُن کہانیوں کی ایک کتاب نظر آتا تھا، ورق ورق بکھری کتاب۔ ہر دل میں ایک تڑپ، ایک احساس اور ایک درد نظر آتا تھا لیکن زبانیں خاموش تھیں۔ راستے مسدود تھے۔ عالم عالم تاریکیوں میں ڈوبا تھا اور المیہ یہ کہ اس دوراں کشمیر میں الیکٹرانک میڈیا نے اپنی ایک **mushroom growth** پیدا کی تھی اور یوں فنون لطیفہ کا ایک نیا منظر نامہ تحریر کیا گیا تھا جس میں بقول ایک ذمہ دار الیکٹرنک

میڈیا کے سابقہ سربراہ کے ''۔۔۔کی ایک فوج تیار ہو چکی تھی''۔ بہر حال اخبار ''المختار'' کو ایک معیاری اور مقبول اخبار بنانے کا میرا خواب ابھی تعبیر کی تکمیل کا خواہاں تھا کہ مجھے اس اخبار کو بند کرنا پڑا۔ آجکل میں اس اخبار کی دوبارہ اشاعت کے سلسلے میں سرگرم عمل ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ میں عنقریب ہی اپنی اس خواہش کو اپنے پُرخلوص قارین کے طفیل پورا کرنے میں کامیاب ہو جاونگا کیونکہ مجھے اسلام آباد کے اس خوبصورت قصبے سے ایک مکمل اخبار کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ یہاں سے مقبول ویرے کا ''کشمیریت''، شبنم کا ''شیش ناگ'' اور اب ''پکار'' قاسم سجاد کا ''شہاب'' اور عبدالرشید ہلال کا ''ہلال نو'' ایک زمانے میں عبدالرشید ڈار (موجودہ چیرمین لیجسلیٹو کونسل) کا ''چراغ آرزو'' اور ایسے ہی کئی اور اخبار اپنے پر پھیلانے کی سعی کر چکے ہیں لیکن ابھی تک ان میں سے کسی ایک نے مقبول اخبار ہونے کا عملی دعویٰ پیش نہیں کیا ہے حالانکہ اس قصبے کے بارے میں عام تاثر یہی ہے

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی''

ادبی لحاظ سے اس قصبے میں ستھر کی دہائی میں ''حروف'' نام کا ایک ادبی رسالہ چند شماروں کے بعد ہی معاشی لحاظ سے کمزور پڑ کر بند ہو گیا، اسکے بعد میں نے ''لفظ لفظ'' کو باقاعدہ بنانے کی لاحاصل سعی کی۔ ظفر فاروق صلاتی نے ''قاشیں'' کو طباعت کے لحاظ سے معیاری بنانے کی کوشش تو کی لیکن وہ بھی زیادہ دیر تک اس شوق کو قایم نہ رکھ سکے۔ صحافت کے حوالے سے ہی شمیم احمد شمیم کے قلم اور اُن کے اخبار ''آیئنہ'' کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ باب ادھورا رہ جائے گا۔ شمیم صاحب سے ملنے کا اتفاق مجھے تب ہوا جب وہ ناسازِ طبعیت کی وجہ سے اپنے کمرے سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ مجھے اُن کی تحریروں میں ایک بلا کی کاٹ محسوس ہوتی تھی اور اگر کبھی میں نے کسی قلم کار کی تحریروں کو اپنی صحافت کے دوراں شعوری یا لاشعوری طور ذہن کے پردوں پر منعکس کیا ہے تو وہ مرحوم شمیم صاحب کی تحریریں تھیں۔ کشمیر کی صحافتی دنیا میں مجھے محترم محی الدین صوفی کی تحریریں بھی کافی متاثر کن لگتی ہیں۔ صحافت کے اعلیٰ قلمکار مرحوم شمیم کی بے وقت موت کی تلخ

یادوں کے دوران ہم نے اچھ بل کے مقام پر ''رائٹرس کلب سرینگر'' بزم ادب اسلام آباد اور ''محفل فکر وسخن '' کے باہمی اشتراک سے ایک یادگار ادبی تقریب منعقد کی۔ اس محفل میں غلام نبی ناظر، عمر مجید، شمس الدین شمیم، گلشن مجید، فاروق آفاق۔ قاسم سجاد، مقبول وی رے (دلکش)، عبدالرشید فراق، مظفر حسین عطار، جاوید آزر، ثناء اللہ میر، محمد شفیع مہر، جاوید شبنم، عطا محمد میر، سروانند کول پریمی، عبدالحمید مہربان، ، منیر احمد منیر، ایس، ایم، قمر، رفیق ہمراز اور دیگر بہت سارے ادیب اور ادب نواز موجود تھے۔ ان دنوں یہاں کے مقامی ادیبوں میں مل جل کر کچھ کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

ادبی دنیا میں ایک اجارہ داری کا رجحان ریاست کے اکثر نوجوان ادباء کو رہا ہے اور اسی رجحان کو کم کرنے کیلئے یہاں کے چند اخبارات نے وقتاً فوقتاً ادبی صفحے مرتب کئے۔ ان میں اخبار ''آیئنہ'' میں فاروق آفاق اور اخبار ''نوائے صبح'' میں جاوید آزر کی زیر ادارت ادبی صفحوں میں مقامی ادیبوں کی اچھی خاصی شعری اور نثری تخلیقات نظر نواز ہوتی تھیں۔ ''آیئنہ'' کے گوشے ادب میں ''رگِ سنگ'' کالم کے تحت میرے اور مقبول وی رے کے درمیان ایک ادبی جنگ شروع ہوگئی تھی جو ایک اچھے خاصے ادبی حلقے کا احاطہ کرسکتی تھی لیکن بعد میں اُس بحث ومباحثے میں مخالف طرف سے کچھ ایسے خطوط بھی شامل ہوئے جن کے بارے میں خود اس صفحے کے انچارج کا یہ نوٹ قابل غور تھا کہ وہ سب خطوط ''ہم شکل اور ہم خیال'' ہیں اس لئے اُن آرا کے معتبر ہونے پر شک کی مہر لگ گئی اور میں نے بھی بعد میں اس سلسلے کو اپنی جانب سے منقطع کر دیا۔ دراصل ہماری ان تمام کوششوں کا ایک ہی مقصد ہوا کرتا تھا کہ ادبی دنیا میں ایک ارتعاش، ایک تلاطم قایم رہے کیونکہ خاموشی موت کی علامت ہوتی ہے اور کشمیر کے نوجوان ادبی حلقے میں ایک جمود طاری نہ ہو لیکن آج جب کہ ادب کے میدان میں پُرانے تناور درخت اپنے اردگرد کے تمام چھوٹے چھوٹے پیڑوں کو کاٹ کر اپنی سرداری کا سکہ بدستور جمانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ کہنا مبالغہ آمیزی کے مترادف نہ ہوگا کی اب ادب میں ادبی محفلوں کا رواج کم اور گروپ ازم

کے بل پر ''من ترا حاجی بگویدتو مرا حاجی بگو'' کے مترادف ایک اندھی دوڑ کا تماشہ چل رہا ہے۔ قوم کے لُٹنے کا ماتم کرنے والے قوم کے ہی غم میں ڈنر کھاتے ہیں۔ جس کی جتنی پہونچ ہے وہ اُتنا ہی بڑا ادیب ہے۔ کلچرل اکادمی کو سالانہ کارکردگی کی فکر ہے نہ کہ ادبی کاروان کا غم۔ نئی پود کے تئیں سرد مہری آنے والے ادبی کل کے لئے سم قاتل۔ گورنمنٹ اداروں کی جانب سے شایع ہونے والے رسالے اب ادیبوں کو ملنے کے بجائے کسی پنواڑی کی دکان پر ''تمباکو کی پوری'' کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے سب سے طاقت ور ادارے دوردرشن میں اردو ڈرامہ کا مسودہ اُن افراد سے منظور کروایا جاتا ہے جن کو اردو ادب کی الف بے کی بھی کوئی واقفیت نہیں۔ اور یہ عالم تو لایقِ حیرت ہے کہ کشمیری ڈرامے اُن افراد کے ہاتھوں میں سونپے گئے جنہیں کشمیری زبان سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ ایسے میں نہ جانے کتنے نوجواں قلم کار گمنامی کے اندھیروں میں قید ہیں اور نہ جانے کتنے قید ہونے کے لئے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لے چکے ہونگے۔ بہرحال یہ اُن زخموں کی چُبھن ہے جو مجھ جیسے کئی قلم کاروں نے سہے ہیں اور یہ اپنی زندگی کے ماضی کے ورق اُلٹتے ہوئے نگاہوں کے سامنے آہی جاتے ہیں

ماضی کی اسی کہانی میں میری ذاتی زندگی کے وہ خوبصورت پل بھی ہیں جب ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو میں روبینہ شاہین کے ساتھ شادی کے بندھنوں میں بندھ گیا۔ اُس پل میرے ادیب دوستوں کا وہ ہنگامہ میرے ذہن و دل پر آج بھی چھایا ہے اور رفیق اشبری، بشیر دادا، عطا محمد میر، فردوس گل، ظفر فاروق صلاتی، کی وہ منظوم نیک خواہشات آج بھی میری ڈائیری میں میرے ان الفاظ کے ساتھ قلمبند:

''میں نہیں جانتا کی میری زندگی کے اس اہم اور نئے پڑاو پر تھوڑی دیر رُک کر میں نے کیا محسوس کیا، لیکن میں یہ ضرور دیکھ رہا ہوں کہ اس نئی ڈگر پر میرے ماحول میں ایک جدّت آئی ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ اُسے ہر حال کا علم ہے کہ کیا میری ان کاوشوں کے طفیل ایک نئی خوشبو ، ایک نیا ولولہ ، ایک نئی پختگی ، ایک بالغ نظری

آسکتی ہے ، گو کہ میرے دل میں یہ ایک احساس موجزن ہے کہ مجھے اب زندگی کی نت نئی ذمہ داریوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہے''

یہ الفاظ اس بات کے شاہد تھے کہ ایک نئے احساس نے دھیرے دھیرے میرے اندر ایک تغیر کو جنم دینا شروع کیا تھا۔ زندگی کی اس نئی رہ گذر پر میری ہمسفر نے میرا ساتھ اس حد تک دیا کہ ہم دھیرے دھیرے ایک خوشحال زندگی کی حدود میں داخل ہونے لگے لیکن انسان بھلے ہی زندگی کے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو زندگی کی کسی بھی رہگذر پر گامزن ہو زندگی اُسے ایک ایسے پڑاؤ پر پہنچا ہی دیتی ہے جس کا احساس شاید انسان کو تب ہوتا ہے جب وہ لمحہ اس کے سامنے اپنی تمام تر تلخیوں اور حقیقتوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء جمعہ کے دن کا وہ پہلا پہر جب ظاہراً آسمان پہ ایک سورج تاباں تھا۔ سارا عالم روشن تھا، ہوائیں حسب دستور رواں تھیں اچانک میری زندگی میں اندھیرا چھا گیا۔ میری دنیا سے میرا سورج، میری زندگی کا ایک مہکتا لمس مجھ سے بچھڑ گیا۔ میری شفیق اور سادگی کی پیکر ماں مجھے داغِ مفارقت دے گئی۔ میری صابر ماں کا صبر تب عالمِ بقا کی خاموشی میں بدل گیا تھا جب اُسے اب ایک لمبے تھکان بھرے سفر کے بعد آرام کی ضرورت تھی اور عرش اعلیٰ کا وہ کارساز ہی اپنی حکمت سے واقف ہے کہ اُسنے میری ماں کے ایک دائمی سکون کا ایسا اہتمام کیا کہ اب نہ میری ماں کو اپنے لاڈلے کی فکر تھی نہ زمانے کے ستم کا احساس۔ وہ شرافت اور پردہ داری کی ایک ایسی تواریخ مرتب کر کے اپنے خالق حقیقی کے دربار میں پہونچی کہ آج بھی جب ہمارے علاقے میں کسی بیٹی کے سامنے پردہ داری اور شرافت کی مثال دی جاتی ہے تو میری والدہ کا نام ضرور لیا جاتا ہے جس نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی ایک مسلمان خاتون کی ذمہ داریوں سے دامن چھڑایا ہو۔ والدہ کی وفات کے بعد تو جیسے میرا عالم ہی بدل گیا۔ میں نے پہلی بار والد صاحب کے آہنی عزم کو ہلتے ہوئے محسوس کیا۔ پہلی بار گھر کے بدلتے رنگوں کا احساس ہوا اور پہلی بار یوں لگا کہ یہ عالم جسکو مسخر کرنے کی بچپن سے جستجو ہو رہی تھی، عالمِ بے ثبات ہے، نہ اسکی کوئی دنیاوی منزل دائمی اور نہ اسکا کوئی راستہ پُر کیف۔

تنہائیوں کا زہر دھیرے دھیرے اینٹ گارے کی بنی دیواروں میں سرایت کر گیا۔

ایسے میں ایک دلی خواہش یہ رہ گئی تھی کہ ماں نہ سہی، والد صاحب ہی اُس سکون، اُس آرام کا حق پا سکیں جسکے لئے اُنہوں نے مجھے سمندر کی طغیانی سے بچا بچا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ لوگوں میں میری ایک پہچان بن گئی تھی لیکن دور کھڑا مقدر شاید میری اندرونی کیفیت دیکھ کر ہنس رہا تھا اور عزم صمیم کے بلند مینار، میرے والد صاحب (الحاج ثناءاللہ) ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء جمعہ کی رات اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہ دن نہ صرف میری زندگی کا ایک تاریک دن تھا بلکہ اس دن کشمیر کی تاریخ میں بھی ایک سیاہ باب لکھا گیا۔ اُسدن جب ہم والد صاحب کی تجہیز و تکفین کے بعد نماز جمعہ سے فارغ ہوئے تو بجبہاڑہ کے تواریخی قصبے میں بتالیس (۴۲) شہیدوں کے خون نے کشمیر کی دھرتی کو لالہ زار کر دیا۔ سارا کشمیر عالم یاسیت میں ڈوب گیا اور ان ہی لمحات میں انفرادی درد پر اجتماعی درد نے فوقیت حاصل کی اور یوں جب چہارم کے بعد یتیمی کا سرسراتا ہوا سانپ پھن پھیلائے میرے مختصر عیال کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی، کوئی نہ تھا جس کو آواز دیتے، کوئی نہ تھا جو ہمارے درد کا مداوا کرتا۔ بس وہ تھی، میں تھا، ہمارے دو معصوم بچے تھے ۔وہ رات جب اُس چھوٹے سے مکان کے تنہا کمرے میں دو معصوم بچوں کے ساتھ ہمیں اکیلا چھوڑ کر سب اپنی اپنی دنیا میں واپس لوٹ چکے تھے ہم دونوں نے بار ہا ایک دوسرے سے پوچھا تھا ''تنہائی سے ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟''۔ ڈر نہ تھا لیکن آسمان کے ماتھے پہ چھائی لہو کی ایک شفق بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایسے میں عجیب طرح کے وسوسے اور خیالات ذہن و دل کو آگھیرتے تھے۔

ایسے میں اپنی دکان پر لگی وہ quotation جیسے میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔

count your life by smiles, not tears

count your age by friends , not years

کیا سچ مُچ گذرے برسوں میں ہم نے کسی سے محبت نہیں کی تھی، کسی کو دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے نہیں چاہا تھا۔ چہروں کا ایک کارواں یادوں کی رہ گذر پر دھول اڑاتا ہوا گزر رہا تھا لیکن نہ کوئی ہمدم تھا اور نہ کوئی دوست۔ ذمہ داریوں کا ایک حصار اپنا چہرہ بدل چکا تھا، پھر ایک بار ایک اور زندگی جینے کی ضرورت تھی۔ دامن دامن اپنا آپ بانٹنے کا عمل جاری تھا بقول قتیل شفائی

خود کو میں بانٹ نہ ڈالوں کہیں دامن دامن
کر دیا تم نے اگر میرے حوالے مجھ کو

زاہد کی اُڑان ایک جانب اپنے پر تول رہی تھی اور دوسری جانب ''مختار'' اپنی حدوں میں قید ہوتا جا رہا تھا۔ ان ہی دنوں مرحوم قاضی نثار صاحب میرے گھر تعزیت کے لئے تشریف لائے اور اُنہوں نے ایک گہری بات کہہ دی ''زاہد یہ زندگی اسی کا نام ہے یہاں ایک پل میں بیٹا باپ کی موت کے بعد گھر کا ذمہ دار شخص بن جاتا ہے، میں خود اس المیے سے گزر چکا ہوں'' قاضی صاحب کی اس بات نے جیسے مجھے زندگی کے کئی برس ایک ہی جست میں عبور کرنے پر آمادہ کر دیا۔ اسکے بعد میں نے زندگی کو ایک جہد مسلسل کی طرح قبول کیا اور یوں پھر سے ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ کاروانِ حیات میں شامل ہو گیا لیکن کہیں پہ ایسا ضرور محسوس ہوتا تھا

قلم، تختی، سیاہی، حرف، کاغذ میرے اندر کا بچپن سو گیا ہے

۱۹۹۴ء کے بعد جب میں نے ادبی دنیا میں پھر عملی طور قدم رکھا تو ادبی دنیا میں کئی لوگوں نے چند معرکے سر کئے تھے۔ کچھ ''ایوارڈ یافتہ'' بھی ہو چکے تھے، لیکن وادی کشمیر میں پرنٹ میڈیا یا ادبی لحاظ سے ایک واضح جمود کا شکار ہو چکا تھا خاص کر میرا وہ حلقہ احباب جن کے دم سے محفلیں بڑی دلنشیں ہوا کرتی تھیں۔ اگر چہ انفرادی طور پر کچھ اچھی کتابیں منظر عام پہ آئی تھیں لیکن اُن ادبی سرگرمیوں کا وہ لمس کہیں موجود نہ تھا، ''آتش چنار'' کے بجائے ''سُلگتے چنار'' تھے ہر چہرے پر کئی چہرے تھے اور انسان وزماں کو پہچاننا مشکل۔ ایک نفسا نفسی کا عالم ذہن و دل کو

کچھ لکھنے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اس دوران اگرچہ میں نے دوردرشن کے لئے تقریباً چالیس اردو و کشمیری سیریلز لکھے جن میں ''تنہائیاں۔ شیڈوز۔ انتہا۔ روسل میر۔ حبہ خاتون، صدمیر، بدلتے رنگ، منزل، ہی مأل نأ گرأے، کُنبر، نیل مۆ، اسان گندان، ٹیوٗٹھ مُدھر، بیوٗچ کمپیوٹر جن، بے نقاب، وادیاں پیار کی، شب رنگ، سُلگتے چنار، گھروندے، چمن چمن گلاب، لکیریں، دہلیز، لوکٹے موکٹے تارکو، آنگن، یم کم زولانہ شامل ہیں۔ دوردرشن سے دوبارہ وابستگی کے بعد مجھے مرحوم محمد امین شاکر، شوکت شہری، ڈاکٹر نذیر مشتاق، محمد امین بٹ، راجندر سنگھ رینہ، اور دیگر باصلاحیت قلم کاروں کی محبت اور عنائیت حاصل ہوئی لیکن یہاں یہ کہنا بھی مبالغہ آرائی کے مترادف نہ ہوگا کہ یہ ادارہ اب چونکہ ادبی کم اور پروفیشنل زیادہ بن گیا ہے اس لئے یہاں کا ادبی ماحول کچھ بکھرا بکھرا سا لگتا ہے اور میرے اکثر ہم عصر، ادب کے تیئں اس ادارے کی سرد مہری اور چند بارسوخ افراد کی اجارہ داری سے کافی رنجیدہ نظر آرہے ہیں۔

اس دور میں میں نے کئی رسالوں اور اخبارات کے لئے لکھا۔ ایک دوبار میں نے حسب روایت اپنے غریب کدے پر ادبی محفلوں کا اہتمام بھی کیا لیکن وہ حسین پل جیسے کسی لق و دق صحرا میں کھو گئے تھے کیونکہ اب یہاں ادیب رہتے ہیں، قلم کے جادوگر رہتے ہیں، خوبصورت شاعر رہتے ہیں، غضب کے افسانہ نگار رہتے ہیں، اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ نگار اور صحافی رہتے ہیں لیکن صاحب دل کہاں کھو گئے کوئی علم نہیں، وارداتِ روز و شب کو، سانحوں اور حادثوں کو، ظلمتوں اور ضیا پاشیوں کو سب نے متاع دکان بنا دیا ہے۔ ان میں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا، کوئی یادوں کے گلشن نہیں مہکاتا، کوئی خلوص کی آبیاری نہیں کرتا، نہ کوئی کسی سے بنا مطلب کے ملتا ہے اور نہ ہی اب کوئی کسی کو خط لکھتا ہے۔ سب اچھے بُرے، ادنیٰ اعلیٰ، چھوٹے بڑے ادیب ہیں صرف ادیب۔ جن میں اکثر دوردرشن کے منڈی ہاوس سے ریڈیو کشمیر کے ڈیوٹی روم تک۔ کلچرل اکادمی سے لیکر ساہتیہ اکادمی کی دہلیز تک جبہ سائی کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان میں کوئی کسی کا دوست

نہیں ، رفیق نہیں، رقابت بھی ہے تو حسد آمدن کی نہ کہ رشک فن کی ۔ کہانیوں کے پلاٹ، شاعری کا تخیل اپنا ماتم آپ کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ حال یہ ہے کہ اب رام کے رتھ پر راون سوار دکھائی دیتا ہے اور اللہ کے منبر پر شیطان براجمان، اب یہاں ابابیلیں لوٹ کے آئینگی بھی یا نہیں، کوئی جگنورات کے کسی لمحے کو پاش پاش کر سکے گا یا نہیں کسے معلوم۔ شاید میرا یہ ادنیٰ سا شعری مجموعہ ''سُلگتے چنار'' ایسی ہی بے ترتیب سوچ کا مضمر ہو لیکن میں اسے اپنے خیر خواہوں اور میری شاعری کے اُن چاہنے والوں کے لئے ایک ادنیٰ سا تحفہ جان کر پیش کر رہا ہوں جن کی بدولت میرا فن زندہ ہے۔

قرآن پاک کی اکثر آئیتوں میں ارشاد ہوا ہے کہ انسان میں نہ اُتنا علم ہے اور نہ ہی اُتنا شعور کہ وہ خالق حقیقی کی اس حکمتِ عملی کو سمجھ سکے جس حکمت کے تحت وہ ایک پوری کائینات چلاتا ہے۔ میں نے بھی اپنے والد صاحب کے طفیل چند بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر یہ بات اپنے فہم و ادراک میں بسانے کی سعی کی ہے کہ عالمِ ناپائیدار میں جس قلم کو تھام کر ہم خود کو عالم، فاضل یا قلمکار تصور کرتے ہیں وہ قلم ہمیں نہ کسی مکتب سے، نہ کسی یونیورسٹی سے اور نہ ہی کسی ادارے سے ملا ہے بلکہ ہر فن اللہ کی جانب سے ودیعت ہوتا ہے اور ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اللہ کے بخشے اس قلم کا احترام نہ کریں کیونکہ اللہ کی چند عزیز چیزوں میں قلم بھی شامل ہے اور اس بارے میں قرآن پاک کا ارشاد ہے ؏

ن' والقلمہ و ما یسطرون

خدا بہتر جانتا ہے کہ ''سُلگتے چنار'' کے بعد میری کون سی تصنیف آپ کے سامنے آئیگی جبکہ سلسلہ روز و شب کے ساتھ احساس و عمل بھی موجود ہے تاحال لیکن میں اپنی کہانی کے بارے میں اتنا کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ یہ کہانی میرا لکھا ہوا کوئی ڈرامہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی تجسُس ، کوئی دلچسپ واقعہ یا کوئی دل کو چھو لینا والا مکالمہ ہوتا۔ یہ کشمیر کے ایک چھوٹے سے

قصبے میں رہنے والے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے ایک انسان کی کہانی ہے جو آپ کے درمیان رہا ہے لیکن اُس نے جو محسوس کیا وہ قلمبند کرتا رہا کسی نہ کسی رنگ میں کیونکہ ؎

سمندر میں سمندر بولتا ہے
کلیجہ منہ کے اندر بولتا ہے

زاھد مختار
نئی بستی اسلام آباد (اننت ناگ) کشمیر



حمد باری تعالیٰ

جو تخلیق کرتا ہے مخفی، عیاں کو
ظہور اُسنے بخشا ہے ہر اک سماں کو
حروفِ قلم میں وہ سکت نہیں ہے
جو تحریر کردے خدا کے بیاں کو
محمد ﷺ سے روشن کیا جسنے عالم
مقام و مکاں کو ، حدِ لا مکاں کو
جو تاریک شب کو سویرا بنا دے
شرف کس نے بخشا ہے ایسا اذاں کو
وہ وحدت میں واحد کا مرکز ہے ایسا
نہ تابِ نظر ہے ، نہ وسعت گماں کو
وہ شفقت کا تابان ایسا ہے سورج
کرن سے ہی صورت عطا کی ہے ماں کو
میں ادنیٰ سا زاہدؔ، وہ مختار میرا
چلائے اشارے سے دونوں جہاں کو

ھدیہ نعت

کچھ حرف نورانی ملیں، اشعار لکھیں گے
آیت کی اِک تفسیر سے، کردار لکھیں گے

تھی عرش کی قسمت کہ ہوا وہ بھی قدم بوس
تعظیم میرے رب نے کی، اسرار لکھیں گے

جب ریت کے ذرّوں کی اُس خوشبو کا ذکر ہو
ہم گنبد خضریٰ کا وہ گلزار لکھیں گے

جب چاند نے بھی چاک کیا سینہ بصد شوق
ہم نور خدا کا اُنہیں انوار لکھیں گے

ہے فکر کی وسعت میں میرے بس یہی منظر
ہم عرش و قلم کا اُنہیں مختار لکھیں گے



لہو کا اک سمندر پی چکا ہوں
میں ہر اک زخم دل کا سی چکا ہوں
کہ خود میں قید رہ کر عمر گذری
سزائیں کاٹ کر میں جی چکا ہوں







غزلیات

چاک جب لفظوں کے سینے ہو گئے
اپنے آنسو بھی نگینے ہو گئے

آؤ دو پل زندگی سے پیار کی باتیں کریں
پھر کسی آنگن کسی دیوار کی باتیں کریں

ہم نے مانا دو طرف کی آگ ہے جل جائینگے
پھر نہ کیوں تپتے ہوئے رخسار کی باتیں کریں

چاند کے ٹکڑے تو چُن لیں راکھ کے اُس ڈھیر سے
پھر تصور میں کسی دلدار کی باتیں کریں

قلب میں گر حوصلہ ہے جا کے جہلم روک دو
پھر کسی سرحد کسی تلوار کی باتیں کریں

ہم نے تتلی کے پروں پر لکھ دیا ہے اشتہار
کیوں کسی بے جان سے اخبار کی باتیں کریں

ایک صف میں ہم بھی دیکھیں قد سبھوں کا ایک بار
پھر کسی زاہدؔ کسی مختارؔ کی باتیں کریں

تبسُم کو لہو سے دھو گیا ہے
زمیں میں کون خنجر بو گیا ہے
قلم، تختی، سیاہی، حرف ، کاغذ
میرے اندر کا بچپن سو گیا ہے
ہواؤں نے بکھیرے کتنے آنچل
میرے گاوں کا منظر کھو گیا ہے
تمہارے شہر میں کیا دِلکشی ہے
نہیں لوٹا وہاں سے جو گیا ہے
کبھی زاؔہد کسی کے دل میں بھی تھا
یہ قصّہ اب پُرانا ہو گیا ہے

ہر اک آنکھ میں نیلا پتھر ، اپنا شہر پرایا سا
گلی گلی میں ہر سو بنکر، اپنا شہر پرایا سا

اخباروں میں اب تو کوئی کالی سرخی ہوتی نہیں
ہر اک ورق کا حرف ہے معطر، اپنا شہر پرایا سا

پُر رونق اُن بازاروں میں دیواروں پر لکّھا ہے
شیشے میں ہیں بِکتے پنجر، اپنا شہر پرایا سا

آوازوں کی قبروں پر ہے خاموشی کی چیخ و پُکار
سارے مکیں ہیں جیسے بے گھر، اپنا شہر پرایا سا

زاہد اوروں کو مت دیکھو، اپنے اندر جھانک تو لو
کس کی روح ہے، کس کا پیکر، اپنا شہر پرایا سا

اپنے پہ ترس آئے نئی بات نہیں ہے
پُر کیف مقدر میں کوئی رات نہیں ہے

چھو کر جو نہ آئی ہو کبھی تیری نظر سے
تسلیم میرے دل کو وہ سوغات نہیں ہے

تاثیر بہکنے کی تیرے وصل کی مانند
بخشے جو میرے ہوش کو برسات نہیں ہے

یوں ہم نے ترے در کو بھی چوما ہے جبیں سے
اک شوخِ وفا، خواہشِ خیرات نہیں ہے

زاہد بھی تجھے بھسم ہی کر دیگا تپش سے
سیدھی سی ہے یہ بات، کرامات نہیں ہے

بات کی بھی بات دیکھی جائے گی
جب میری اوقات دیکھی جائے گی

رنج و غم کی یوں تو ہونگی مجلسیں
موت کی پر ذات دیکھی جائے گی

عمر گذری تنگ شہروں میں مگر
قبر کی اک رات دیکھی جائے گی

ناتواں دل اُف نہ کر بس ایک دن
درد کی بھی مات دیکھی جائے گی

زاہدی میں میٹھی یادوں کی چبھن
ایک اپنے ساتھ دیکھی جائے گی

جس مکاں میں سنگِ باراں سے پناہ لینے گیا
اُس مکاں کی گرتی دیواروں سے وحشت ہوگئی

وقت کی ٹہنی پہ ٹھہری ہیں حسیں کچھ ساعتیں
پیڑ کے سائے سے آخر کیوں یہ اُلفت ہوگئی

تیرگی کے غار میں کچھ سرسراہٹ آشنا
روشنی کی چاپ سُن کر مجھ کو دہشت ہوگئی

قتل گاہ پہ کتنے بے گانوں کو کٹتے دیکھ کر
مجھ کو اپنی کج روی سے کیوں یہ اُلفت ہوگئی

ہم سجا کر جب بھی آئے مدعا کی اک برات
وصل کے آنگن سے ڈولی اُن کی رخصت ہوگئی

تیرے شہر میں اک شہزادہ سیدھا سادھا آیا تھا
کچھ پل گم سم ٹھہرا لیکن، کیا کھویا کیا پایا تھا

کرنوں نے اک شعر کہا تھا، رات نے دی تھی داد بہت
چاند نے چپکے چپکے گا کر، سورج کو اُکسایا تھا

رستے گھر کو جاتے تھے سب، جانے میں کیوں بھٹک گیا
یا تو تیرا عکس تھا آگے یا پھر پیچھے سایا تھا

میرے گھر کے دروازے پر کوئی دستک دیتا ہے
بند لفافے میں بھی اکثر کورا کاغذ آیا تھا

زاہدؔ اپنے لمبے سفر میں تنہا تنہا تو بھی نہ تھا
تیرے تصور کے پردوں پر کوئی کیوں پھر چھایا تھا

چاک جب لفظوں کے سینے ہوگئے
اپنے آنسو بھی نگینے ہوگئے

مخملی دھرتی پہ ڈالی کس نے راکھ
آنکھ سے اوجھل دفینے ہوگئے

ہر کوئی جب نا خدا بننے لگا
کاغذی سارے سفینے ہوگئے

تیرے بن تھی جستجو، پر تیرے ساتھ
کتنے مشکل لمحے جینے ہوگئے

منتظر زاہدؔ رہا اک عمر تک
مسترد سارے قرینے ہوگئے

پُر اثر جب بھی صدا ہو جائے گی
انتہا پھر ابتداء ہو جائے گی

چوم لے گا وہ بھی میرے نقشِ پا
ہر عبارت پھر ہوا ہو جائے گی

وہ لپیٹیں گے کسی چادر میں کل
آج دنیا بے قبا ہو جائیگی

میں بنا کر پھر بگاڑونگا تمہیں
یوں تمنا لا فنا ہو جائے گی

عکس پا کر کود جائینگے سبھی
جب سمندر سے خطا ہو جائے گی

سمندر میں سمندر بولتا ہے
کلیجہ منہ کے اندر بولتا ہے

نگلتی ہے ندی اب گوریوں کو
کنارے کا وہ اژدر بولتا ہے

ابابیلیں گئیں ہیں روٹھ کے اب
میرے گھر کا یہ کھنڈر بولتا ہے

گلوں میں آگ ہے ہر رنگ جلے گا
یہ تتلی کا مقدر بولتا ہے

سنگِ ساحل کی طرح اک بوند کو ترسا کیا
موج آئی، آ کے گزری اور میں دیکھا کیا

سو چکی تھی کر کے چلمن بند، اُوڑھے راحتیں
وہ چھلکتا نور ہی تھا جس کو میں دیکھا کیا

رات بھر ٹپکا جو پانی ، وہ بہا کر لے گیا
ایک تصویرِ تصور ، اور میں سوچا کیا

تپتے صحرا میں تھا مجھ کو ایک احساس فنا
بن کے آنسو پھر بھی ٹپکا اور پھر چمکا کیا

ایک سنگِ در سجا کر وہ مکاں لے جائیگا
ایک ایسا شخص ہوگا ، کارواں لے جائیگا

ہم نے فصلِ ذہن و دل رکھ دی ہے گروی جسکے پاس
حرف کا موسم بدل کر وہ زباں لے جائے گا

خوشبوؤں کے شہر سے کچھ بھی نہ لے پائیگا وہ
آشیاں میرا جلا کر بس دھواں لے جائے گا

میں زمیں کی سرحدوں کا جب نہیں قائل تو پھر
وہ میرے حصّے کا کیسے آسماں لے جائے گا

میرے بچے کے تصور میں نہیں پریوں کا خواب
وہ وراثت میں میری اک کہکشاں لے جائے گا

تم کہانی کے سبھی کردار بن کر جان لو
ایک دن زاہدؔ اُبھر کر داستاں لے جائے گا

کچھ لہو اپنے ہی دل کو بھی پلائے رکھنا
رابطہ خود سے کبھی خود ہی ملائے رکھنا

جذبۂ دل کے بھی بازار سجے ہیں لیکن
تم نہ مہندی سے رچے ہاتھ سجائے رکھنا

میرے جانے سے تمھیں دل میں مسرت ہوگی
رسمِ دنیا کیلئے ہاتھ ہلائے رکھنا

یہ ہوائیں بھی تو چپ چاپ گذر جائینگی
ایک شمع کسی چوکھٹ پہ جلائے رکھنا

وہ ستاروں سے سجاتا ہے اکیلے دامن
تم بھی چادر کی لکیروں کو سلائے رکھنا

آئینے کے پار اُتر کر، یادوں میں کھو جائینگے
آدھی کہانی تم دہراؤ ، آدھی ہم دہرائینگے

تم نے بچا کر رکھا ہوگا سایا اپنے حصّے کا
ہم دھوپوں کے ساتھ چلے ہیں، کچھ پل میں جل جائینگے

رات کے آنگن میں اُترا ہے ایک ستارا خواب لئے
آج کہاں اب نیند کی پریاں ڈھونڈ کے پھر سے لائینگے

ہریالی کے بیچ کا رستہ تصویروں میں قید ہوا
یہ تو بہاروں کی باتیں ہیں، آگے لکھتے جائینگے

پہاڑوں سے صدا اک آ رہی ہے
کبوتر، چیل کالی کھا رہی ہے

کھلے میدان میں سب مضطرب ہیں
گھروں میں دھند کوئی چھا رہی ہے

جسے بچپن میں ہم بھی چھیڑتے تھے
وہ پگلی آج بھی کچھ گا رہی ہے

سبھی قبریں کُشادہ ہو چکی ہیں
زمیں اب تنگ ہوتی جا رہی ہے

لکیروں کے گھنے جنگل میں زاہدؔ
ہوائے تُند پھر اُکسا رہی ہے

پُرزہ پُرزہ گلشن دل کی کتاب
روئے گُل پر بھی لہو کی اک نقاب
اس طرف جھٹکا تو اُس جانب حلال
اک لکیر بے صدا کے سو عذاب
کھیل شطرنج کا چلے گا رات بھر
مات و شہ سے بے خبر دونوں نواب
کب وہ دونوں بانٹ لیں کچھ اُلفتیں
آگ کے شعلوں کا کردیں احتساب
شاخ زیتوں لے کے پنچھی تب اُڑا
پتہ پتہ گر چکا تھا جب گُلاب
تلخ یادوں کو بھی اک عنوان دو
مہد سے ہے لحد تک بس اضطراب
ہم درِ مختار پر سر خم کریں
بے کسوں کے سر سے ٹل جائے عتاب

خود سے خود کو چلا ملانے کو
اک تماشا ملا زمانے کو

برف لیکر پہاڑ چڑھتا ہوں
دھوپ سے وادیاں بچانے کو

طفل سب ایڑیاں رگڑتے ہیں
آیئے زم زم کوئی پلانے کو

اِک پرندہ فلک سے اُترا ہے
ریت میں آندھیاں سُلانے کو

کرگسوں کا یہ دور ہے زاہدؔ
کیوں کبوتر چلا اُڑانے کو

چاند کی سرحد پہ شائید یہ خبر پہونچی نہیں
سبز شہروں میں تو برسوں سے اندھیرا ہوگیا

پہلے رہتے تھے سبھی کچے مکانوں میں مگر
اب تو ٹوٹی شاخ پہ سب کا بسیرا ہوگیا

پھول کی پتّی پہ بھی کھلنے لگے نفرت کے خار
میرے پنچھی تیرا پنجرا اور پیارا ہوگیا

ماں کی پیاری گود میں سویا تھا جو کل رات کو
موت کی آغوش میں اُس کا سویرا ہوگیا

سانس لینی ہے تو پہلے کچھ شناسائی بتا
آدمی کے جسم کا سایا گھنیرا ہوگیا

یہ بڑے باریک نکتے ہیں کہاں سمجھو گے تم
آج میرا تھا جو کل سے، پھر وہ تیرا ہوگیا

خاموشیوں کا درد بھی ناسور ہوگیا
اچھا تمہارے شہر کا دستور ہوگیا

ہم نے شرافتوں میں سمندر بھی پی لیے
وہ اک ندی کو روک کر مغرور ہوگیا

ٹکڑوں میں بانٹ لے چکے جب آسمان کو
بادل زمیں پہ آنے کو مجبور ہوگیا

مہکا سکی نہ گھر کو بھی کوئی اگر بتی
جذبہ دلوں سے کب کا بہت دور ہوگیا

خندق بنا کے نام کی سرحد کے آس پاس
مختارؔ اپنے آپ میں محصور ہوگیا

سبھی ہاتھوں میں ہیں پتھر، قدم آہستہ آہستہ
ہمارا شوق ہے بے گھر، قدم آہستہ آہستہ
تصور میں سمندر ہے مگر یہ دل تو تشنہ ہے
میری آوارگی بنجر، قدم آہستہ آہستہ
چلو پھر پھول رکھدیں ایک جانب خار پر چل دیں
کہ ہم ہیں رنج کے خوگر، قدم آہستہ آہستہ
حجاب اشکوں کو کرنا بھی تو آتا تھا گئے وہ دن
کہ ہر اک آنکھ ہے اب تر، قدم آہستہ آہستہ
یہاں ہر در پہ جھکتی ہیں جبینیں 'زندہ قوموں' کی
ہتھیلی پر ہے کسی کا سر؟ قدم آہستہ آہستہ
فضا کے رنگ بھی دیکھے، قضا کا جام بھی پایا
لگے ہے زندگی سے ڈر، قدم آہستہ آہستہ
کبھی مختار سے قربت، کبھی زاہد کو اپنایا
کبھی منظر، کبھی محشر، قدم آہستہ آہستہ

آنکھ کے آنسو میں منظر آ گیا
سر کے اُوپر پھر سمندر آ گیا

دھوم تھی گاوں میں آیا اک فقیر
شہر لیکر کیوں مقدر آ گیا

مقبرے کے بخت میں اطلس کا تار
میرے سجدے میں تو پتھر آ گیا

طِفل تھے تب جب سے تتلی دوست تھی
ارتقاء میں کیسے بندر آ گیا

اپنے حصےّ کے اندھیرے مانگ کر
گھر میں روشن چاند کیونکر آ گیا

دامن کوئی تو ہوگا جو تر نہیں رہا
کہنے کو جو میرا تھا وہی سر نہیں رہا

میں اپنے گھر کی کھڑکیوں کا رُخ بدل نہ دوں
اب سامنے کا گھر تو ترا گھر نہیں رہا

آہٹ وہی ہے دھڑکنوں کا رقص بھی وہی
دستک وہی ہے پر ترا ہی در نہیں رہا

قاتل ہماری جرأتوں سے بوکھلا گیا
اب تیر پھینکتا ہے کہ جب سر نہیں رہا

خلوتوں کے سیاہ جنگل میں کتنے جلوے شکار ہوتے ہیں
بند کر لو دکان چاہت کی اب لٹیرے ہزار ہوتے ہیں

جاتے قدموں کی چاپ سنتے ہی، وحشت دل کا رنگ اُترتا ہے
اُن کے جانے کے بعد آنے کے، پُر لطف اِنتظار ہوتے ہیں

کچھ در و بام بند کرتے ہی ،کروٹوں کا وہ خواب آتا ہے
داغِ دل کا دیا جلائے بھی منتظر کچھ مزار ہوتے ہیں

ہم فصیلوں کے شہر میں آکر، دم سنبھالینگے کن ہواؤں میں
ذرے ذرے شمار کر لینگے، لمحے لمحے فرار ہوتے ہیں

گرم سورج کی ٹھنڈی آہوں میں ، نرم راتوں کے تپتے انگارے
ظلمتوں کے طویل رستے میں، کتنے زاہد نثار ہوتے ہیں

بے گانے موسموں میں سنورنا نہیں کبھی
بکھرے ہوئے دلوں میں بکھرنا نہیں کبھی

آواز دے رہا ہے کوئی کیوں بِلا وجہ
اُنکی گلی سے اب تو گزرنا نہیں کبھی

ہاتھوں میں اپنے میری ہی کوئی لکیر رکھ
آیئنے میں تمہیں تو نکھرنا نہیں کبھی

جن کے سمندروں میں ڈبونے کا فن نہ ہو
اُن پانیوں میں ہم کو اُترنا نہیں کبھی

تیر ظلمت پہ یوں چلائے تھے
کچھ دیئے خون کے جلائے تھے

بند کمرے میں دم گھٹا لیکن
پردے ہر بام پر گرائے تھے

جانے وحشت تھی یا وہ حسرت تھی
تیرے خط میز پر سجائے تھے

زندہ رہنے کی اور مہلت دی
ہم نے کیوں زخم دل دکھائے تھے

اُن کے ماتھے پہ کیوں شکن آئی
ہم نے اشعار چند سنائے تھے

روز آئینے دیکھتا ہوں مگر
اپنی پہچان بھول جاتا ہوں

چشمِ تر کو تلخیوں کی طلب
اپکے خوابوں سے لوٹ آتا ہوں

راکھ رکھ کر ہوا کے دامن پر
یاد خود کو میں کیا دِلاتا ہوں

سرخ دریا کے اُن کناروں سے
پیاس دامن میں بھر کے لاتا ہوں

لوگ اب ہجرتوں کے عادی ہیں
لن ترانی. کسے سناتا ہوں

اب بھی زاہدؔ کو یاد کرتے ہو
اب بھی ہچکی میں ڈوب جاتا ہوں

اپنی اندھیری رات میں تارا بھی سو گیا
اچھا ہوا کہ اُٹھ گئے چراغاں تو ہو گیا

وہ خالی ہاتھ لوٹ کے چہرے کو ڈھانپ کر
کہتے ہیں گُہر لایا تھا، مجھے میں کھو گیا

دریا دلی تھی تیری یا تاریخ کا کمال
اک ورق لے کے آ گیا، محفل میں جو گیا

ظلمت کے ساتھ روح کی بے چینیوں کا جوڑ
مومن دی اذان اور وہ شخص سو گیا

زاہد رقم کرو گے کیا اب حال شہر کا
ہونے کو ہو رہا ہے، ہونا تھا ہو گیا

تجھ کو مٹ مٹ کے اُبھرنا ہی اُبھرنا ہوگا
یا تجھے دھول کی مانند ہی بکھرنا ہوگا

میں ترے خواب کی تعبیر نہیں ہو سکتا
ترے ہر بکھری ہوئی شب کو سنورنا ہوگا

تو بھی مجبور ہے اور میں بھی طرفدار ترا
دھندلے رشتوں کو کبھی دل میں نکھرنا ہوگا

میری منزل ہے بہت دور تھکن زود اثر
تیری آنکھوں میں مجھے اور ٹھہرنا ہوگا

آزمالو جو کہا تم نے مسیحا مجھ کو
بحرِ دل ، بحرِ محبّت تمہیں مرنا ہوگا

زہر گھولے گا وہ پیغام لئے آیا بشیؔر
کیا شبِ وصل سے زاہدؔ کو گزرنا ہوگا

''یہ غزل ۱۹۸۱ء میں بشیر دادا اور میں نے مشترکہ طور لکھی تھی'' (زاہدؔ)

غیروں کا آسمان ہے، کیا آزمایئے
اپنی زمیں پہ دستِ دعا بن کے چھایئے

عرشِ فلک سے بوند اِک ٹپکی تھی رات کو
وہ قافلہ ہے ریت کا سویا، جگایئے

روٹھی ہوئی ہوائیں ہیں، بارش نہ آئیگی
چنگاریوں کا شہر ہے ، دامن بچایئے

شیشے کے اُس بدن کی قبا تار تار ہے
نازل وہ ہوگا شہر میں پتھر سجایئے

اِس برف پہ تمہارے ہی قدموں کا ہے نشان
آجایئے کہ آگ بھی اس پر لگایئے

چاند جلتی رات سے گھبرائے گا
بادلوں کا دل پگھل سا جائے گا
سرحدوں کی دھار پر چل کر کبھی
تر لہو میں کوئی کنگن گائے گا
خود بخود ویران ہونگی بستیاں
کوئی سورج جب نکل کر آئے گا
پیاس کا پنچھی جو لوٹے گا کبھی
اپنا جہلم دیکھ کر شرمائے گا
جب نہ سمجھے گا کوئی زاہدؔ کی بات
شعر کے پیکر وہ خود دفنائے گا

جو پھول بیچتا رہا اپنی دکان پر
چھالے پڑے ہوئے ہیں اُسی کی زبان پر

برسات تیرے کھیت کو آباد کر گئی
اک ظُلم لکھ گئی میرے کچے مکان پر

برفیلے راستوں پہ میرا عکس رہ گیا
میں خود جُھلس رہا تھا کسی آسمان پر

اپنی زمین ہوگی الگ، آسمان بھی
شہروں کے شہر جل گئے اس اک گمان پر

نظرِ کرم کی بارشیں آ کے گذر گئیں
زاہدؔ سکونِ قلب تھا آتش فشان پر

سہما سہما جب اک مصرعہ ، غزل سنائے، تم آنا
روٹھی روٹھی گرم ہوا جب بارش لائے، تم آنا

تپتے گُل کے دامن سے کیوں تم نے چرائی خوشبو ہے
اب جو سُرخی اخباروں کی آگ لگائے، تم آنا

رستہ منزل، خواب تصور، سچائی بس اتنی ہے
دستک کوئی سنّاٹے کی آ کے جگائے، تم آنا

میرے گھر کے دروازے پر کس نے لکھا ہے کاجل سے
ٹکڑا ٹکڑا کوئی آنچل جب لہرائے، تم آنا

زاہدؔ کے گاؤں کا جہلم اب بھی پانی پانی ہے
ہر قصّے کی زندہ کہانی جب بہہ جائے، تم آنا

میں آسماں خود کہکشاں، منظر ترا اپنی جگہ
میں عشقِ خود میں مُبتلا، پیکر ترا اپنی جگہ

صحرائے دل میں بارہا سنگسار بھی ہوتے رہے
پھر بھی سلامت سر میرا، پتھر ترا اپنی جگہ

عرضی مری برسوں رہی دیمک کے رحم و کرم پر
منصف تری خو مضطرب، شہہ پر ترا اپنی جگہ

آجاو ، بدل جاؤ
خود سے تو نکل جاؤ
کیا درد کا موسم ہے
تم بھی تو مچل جاؤ
ہو موم تو جل جانا
پتھر ہو پگھل جاؤ
سورج کا مقدر ہے
کرنوں سے بہل جاؤ
زاہد سے کہے کوئی
کہہ کے تو غزل جاؤ

نظمیں

شفق کی آنکھ یارو پھر سے نم ہے
اُفق کے رُخ پہ پھر سے رنج و غم ہے
یہاں ہر شخص کا آئینہ میں ہوں
میرے ہاتھوں میں نشتر ہے قلم ہے



دیکھ لینا ایک دن یہ حادثہ ہو جائے گا
ایک مٹھی خاک کا پُتلا فنا ہو جائے گا
چیختے ہاکر پھرینگے شہر کے بازاز میں
'کالی سُرخی' کا وہ قصہّ اَن سنا ہو جائے گا



ایک دوپٹے کا ٹکڑا

ابھی کہاں وہ گئی ہیں ساری
جلی جلی سی، لُٹی لُٹی سی
عریاں عریاں لاشیں میں نے
کہ دو بلیوں کے بیچ میں یہ کیوں
اک روٹی پہ جھگڑا کھڑا ہے
روٹی، روٹی، میری روٹی
جس کو بڑے ہی چاو سے میں نے
اپنے گھر کے اُس چولہے پر
بڑے جتن سے تھا یوں بنایا
جیسے جنت کی وہ روٹی
سوچا یہ تھا اُس روٹی سے
اپنے بھوک کے پیٹ کی جلتی، آگ بجھادوں
آگ جو برسوں سلگی سلگی
میرے سینے کے چولہے میں
دہکی دہکی یہ کہتی تھی
بھوک سے کب تک بچتے رہو گے

لیکن میں نے پھر کی جرأت
پھر سے میں نے بھوک سے اپنے
تن کو بچایا، من بہلایا
سوچا جانے کتنے، کیسے
بھوکے ہونگے، پیاسے ہونگے
جہلم بھی تو پیاسا پڑا ہے
دھرتی بھی تو بھوکی کھڑی ہے
دے آؤ نگا روٹی کسی کو
شاید وہ دو ہاتھ پسارے
کوئی دعا دے، کوئی صدا دے
اور فلک سے گرنے والی
سنگ و جفا کی کالی بارش
اُسکی دعا سے تھم سی جائے
بس یہ سوچ کے گھر سے نکلا
سہما، سہما، بچتا بچاتا
اُن راہوں سے جن راہوں پر

خون کی موٹی تہیں جمی تھیں
ہر سو چیخوں کا عالم تھا
ہر سو جیسے سنّاٹا تھا
دور فلک کے چہرے پر بھی
خوف کی جیسے لالی جمی تھی
دھرتی کے سینے میں بھی وہ
سانس کی ڈوری ٹوٹ رہی تھی
آدم آدم کوئی کہاں تھا
روشن دن کی تاریکی تھی
ایسے میں نا جانے کہاں پہ
ہاتھ سے میرے روٹی چھوٹی
میں اُن چہروں میں یوں کھویا
جیسے ہر اک چہرہ، میرا
سینے پر اک ہاتھ جمائے
اک بچہ بھی یوں ہی پڑا تھا
جس کے پاس وہ علم کی ساری

کھلی کتابیں لہو لہو تھیں

دروازے پہ مہندی سجائے
اک دلہن کا لاشا پڑا تھا
دور وہاں نالی کے کنارے
ایک ڈوپٹے کا ٹکڑا تھا
ابھی کہاں وہ گنی ہیں ساری
عریاں عریاں لاشیں میں نے
کہ دو بلیوں کے بیچ میں یہ کیوں
اک روٹی پہ جھگڑا کھڑا ہے
روٹی روٹی، کیسی روٹی
جس روٹی پہ خون لگا ہے

گجرات کے نام

اُسدن
جمہوری دُلہن کی
سالگرہ تھی
دھوم بڑی تھی

جب
اُس قہرِ الٰہی کے خنجر نے
چاک کیا تھا عرض وسما کو
رنگ ونسل اور دین دھرم کے
بھید سے عاری
محوِ جنوں تھا رقصِ بسمل

دھرتی کا وہ چپہ چپہ
نگل رہا تھا آدم آدم
کریا کرم اور کفن دفن کا
ہوش نہیں تھا، جوش نہیں تھا
سب کی کہانی یکساں یکساں
لہولہو عنوان رقم تھا
ہر سُو بس اک شور بپا تھا
”آو یہاں انسان مرا ہے!“
آج بھی
ویسا ہی منظر ہے
آج بھی ہر سو
لاشیں پڑی ہیں!
قہر مگر یہ قہر نیا ہے!

اب کے موت وہ موت نہیں ہے
اب ہر آدم کی پیشانی
الگ الگ ہے، جُدا جُدا ہے
اب یہ آدم کا خنجر ہے
جو بھوکا ہے، جو پیاسا ہے
گلیاں نئی اب، شہر نیا ہے
اب کے رگوں میں زہر نیا ہے
دین و دھرم پر گھاؤ نیا ہے
جانے کس کا داؤ نیا ہے
اب کے بھی اک شور مچا ہے
"کس گھر میں اب کون بچا ہے"
نظر و نگاہ میں اب دوری ہے
اب اک ناری اک نوری ہے
سنگھاسن کی مجبوری ہے
اب یہ موت بھی جمہوری ہے!

صداقت

ایک جرأت کی تھی میں نے
کل بڑی ہی شان سے
کوٹھری میں گیلے گیلے سے پڑے
اُس صِدق کو
اہتمامِ خشک وتر سے
جا کے ڈالا دھوپ میں
اور اُس دم بس فلک کو
تیش ایسا آ گیا
بارشوں نے پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دیا
اور جب تک میں صداقت کو سمٹتا رہ گیا
آسماں نے اُس کے بھی بس پُرزے پُرزے کر دیئے
جانتا ہوں میں کہ تم اک جھوٹ سمجھو گے اسے
میری مانو، صدقِ دل سے جا کے خود ہی دیکھ لو
اپنے جہلم کا وہ پانی سُرخ ہے تو اس لئے ☆☆

الامان

کِس نے مانگی ہیں دُعامیں خلوتیں!
کِس نے جوشِ دل کو بخشی حیرتیں!
رُک گیا ہے کون محور پر یہ آج
کِس نے گردش کو دیا ہے اضطراب
کون پر ہی کاٹ کر قیدی بنا
کون گھر کو پھونک کر بھیدی بنا
کِس نے شرمندہ سی کرلیں ملّتیں
کِس نے باطل کو عطا کی خلّعتیں
کون ہے جو کھا کے تیروں کا یہ وار
جی رہا ہے مُسکرا کے بار بار
کون ہے جو مانگتا ہے الاّماں
میں، کہ میری قوم کا اک نوجواں؟

رقص دیرینہ پھر سے شروع ہو گیا

سبز شہروں کی دھرتی کے خاموش لب
چند صفحوں کو پھر سے سیاہ کر گئے
بہکی نظروں میں پنہاں وہی آرزو
کون تیغوں کے آگے اُٹھائے گا سر
مست جھونکوں میں جھومے ہوئے پھول بھی
سانس روکے تباہی کے ضامن بنے
ایک سرخی میں لپٹے ہوئے ہاتھ کی
ایک فنکار اُنگلی نے جنبش جو کی
رقصِ دیرینہ پھر سے شروع ہو گیا
کوئی پھر سے اُٹھا، کوئی پھر سے گرا
ایک وحشت تھی حیرت تھی حسرت بھی تھی
جو ہر اک رُخ سے آخر ٹپکنے لگی
شہر ویراں ہوئے، قید مسکن بنے
بند ہاتھوں میں کرنے لگے ہیں ہوا
دھڑکنوں کی اذانوں پہ تالے پڑے

تنکے کی تقدیر

شہرِ بے حس کے سارے مکیں آج کیوں
شام ڈھلتے ہی پھر سے سرکنے لگے
ذرہ ذرہ سمیٹے ہوئے وہ بدن
جب بھی گذرینگے گاؤں کے چوپال سے
وہ جو عریاں ہے بے عار بوڑھا شجر
وہ تو صدیوں سے انصاف کے نام پر
اندھی بہری لکیروں کے اک جال میں
قید کرتا ہے انساں کی تقدیر کو
آج بھی وہ اُسی اپنی دنیا میں گُم
میٹھے لمحوں کو مٹھی میں جکڑے ہوئے
اپنے سائے کے دامن پہ لکھ جائیگا
ایک تنکے سے تنکے کی تقدیر کو!

ایک ادھوری نظم

نیم شب میں ہُو کا عالم، میرا سہما سا مکاں
میرے بستی بولتی ہے، کھنڈروں کی داستاں
اک ہجومِ بیکراں کی چیختی آہوں کا شور
سبز شہروں کے ہر اک گھر میں لہو کی کہکشاں

میری آنکھوں کا وہ نیلا اور گہرا سا سوال
آج بھی نظروں میں میری چُبھ رہا ہے پُر ملال
اتنے برسوں سے بنے منصور لٹکے دار پر
نیند سُولی پر بتا آتی ہے کیسے لا زوال

زندگی تو روز و شب کی گردشوں کا نام تھا
رت جگے کا حکم تھا ، اخبار لکھنا کام تھا
میں نے ایسے ہی چھپایا تھا وہ مصرعہ بکس میں
کل گلی کوچے میں دیکھا میرا فوٹو عام تھا

حوصلوں کو خواب کے پیالے پلا کے رکھ دیئے
خواہشوں کے طفل جاگے، پھر سُلا کر رکھ دیئے
میرے گھر کے در پہ لٹکی میری تختی کھو گئی
دوستوں کو خط لکھے تھے، پھر جلا کر رکھ دیئے

میرے اچھے دوست نے بھیجی ہے مجھ کو اک کتاب
لفظ سارے سر کٹے ہیں اور چہرے بے نقاب
جوڑتا رہتا ہوں اک اک ورق کو تحریر کو
اُس کا تحفہ بن گیا ہے زندگی کا اک عذاب

کون اُجڑے دل بسا لے، کس کا ایسا عزم ہے
کس کی یادوں میں سجائی، آج ہم نے بزم ہے
مرثیہ کہنا ہے مجھ کو یا غزل اک طرز میں
میری مجبوری سمجھ لو، یہ ادھوری نظم ہے

اب یہ شہر بھی افسانہ

دور فلک کی اُونچائی پر
اُڑتے ہوئے اک پنچھی نے
نیچے پھیلی اس دھرتی پر
نگاہ دوڑا کر یہ سوچا
کہتے ہیں اس دھرتی پر تو
سب کچھ ملیا میٹ ہوا
چاول، روٹی، خونی کپڑے
کولا، مٹی اور سامان
بچے، بوڑھے، پردہ نشیں کی
ہڈیاں ہڈیاں سب یکسان
میری کوئی تیز نظر بھی
کیسے چُن لے اک دانہ
اب یہ شہر بھی افسانہ

تیرے پیروں کے اُن آبلوں کی قسم !

کون ہے اب تیرا اس جہاں میں بتا
کس سے روٹھو گی تم، کس سے ہوگا گلہ
کیسے کردار، کیسی کہانی بتا؟
کس سے ہوگی تیری چھیڑ خانی بتا؟
جانِ اُلفت کے شیریں لبوں کی قسم
اُن مچلتی تڑپتی شبوں کی قسم
میری پُر خار راہوں کے بخشے ہوئے
تیرے پیروں کے اُن آبلوں کی قسم
جان عالم ہے تو، جانِ زاہد ہے تو
میری اُلفت، محبت کی شاہد ہے تو
یہ زمانہ نہ سمجھا، نہ سمجھے کبھی
میری تحریر، تخلیق واحد ہے تو

آج بھی کیا میری یادوں میں رہا کرتی ہو

ہم نے تو چاہ میں اپنی ہی جوانی کھوئی
بہکے جذبات میں اپنی ہی روانی کھوئی
ہم نے چاہا تھا لکھیں گیت کوئی پیارا سا
اسی ارمان میں اپنی ہی کہانی کھوئی

زندگی زہر سہی پھر بھی پیا کرتے ہیں
مُسکرا کے نہ سہی رو کے جیا کرتے ہیں
تم تو ہر روز کا اک جشن مناتے ہو مگر
ہم تو رات کا ماتم ہی کیا کرتے ہیں

تیری اک یاد مجھے تم سے ملا دیتی ہے
ورنہ تو روز مجھے دل سے بُھلا دیتی ہے
'تو نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح'
ورنہ یہ آگ برابر کی لگا دیتی ہے

اب تو تنہائی میرے ساتھ ہوا کرتی ہے
اب تو یادوں میں تیری بات ہوا کرتی ہے
اب تو پاگل سا بھٹکتا ہوں تیری گلیوں میں
اب بسر آنکھوں میں یہ رات ہوا کرتی ہے

آج بھی کیا میری یادوں میں رہا کرتی ہو
آج بھی کیا میری خاطر ہی سجا کرتی ہو
آج بھی کیا نہیں ملتی ہو کبھی غیروں سے
آج بھی کیا میرا کچھ پاس کیا کرتی ہو

آؤ نس نس میں میری تم بھی سما کر دیکھو
آؤ سب پردے زمانے کے مٹا کر دیکھو
تم نے جینے کے، جتانے کے کئی کھیل کئے
آؤ زاہد کی طرح خود کو لٹا کر دیکھو

سحر ہونے تک

درد کتنا سہے گی یہ رات، سحر ہونے تک
سہے پھولوں پہ یہ برسات، سحر ہونے تک

ہر قدم پر وہ مرا بکھرے ہوئے تنکے چننا
ہے لکیروں کی یہ سوغات سحر ہونے تک

وقت اُڑتا ہے ہواؤں میں لئے پرواز نئ
کیوں رُکے ہیں یہ حالات ،سحر ہونے تک

ہم نے تھامے ہیں بڑی آس لئے زخم سبھی
کوئی سمجھے نہ یہ جذبات ، سحر ہونے تک

زندگی کی اُلجھنوں سے تنگ آئے ہوئے وہ

سارے ذی روح

کالے، گورے، اچھّے، بُرے

ماڈرن، سیدھے سادھے

غریب یا پھر زر کے زرگر

اکثر کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی

نکتے پر آکر ٹھہر جاتے ہیں

اور

یوں نئی، پرانی فائیلوں کا کھول کر دفتر

جی بھر کے صلواتیں سناتے ہیں

زمین و آسمان کو

بنا سوچے، بنا سمجھے

کہ اُن میں ہی کوئی نہ کوئی

کسی نہ کسی رنگ میں

یا زمین بنا ہے

یا آسمان!

زمین آسمان

میرا قصہ بھی قصہ ہی رہ جائیگا

تیری اُلفت کا ہر گُل جو مہکا ہوا
کب تلک اپنی خوشبو دلا پائیگا
وقت کے ہر خزاں کی نظر الاّماں
اپنے ترکش کا ہر تیر خالی کیئے
لے اُڑائیگی خوشبو کے ہمراہ تمہیں
اور تم بھی چلو گی، چلی جاؤ گی
اپنی آنکھوں میں موتی چھپائے ہوئے
میری یادوں کے دیپک جلائے ہوئے
لمحہ لمحہ سسکتی رہوگی مگر
اندھے رستوں کا بہرا سا ہوگا سفر
سُرخ جوڑے کی خاموش لہروں میں گُم
میری دنیا سے کچھ دور ہو جاؤ گی
لے کے حسرت کا اک داغ اُس رات کو
چاند آنگن میں میرے اُتر آئیگا
اور حجرے میں میرا وہ تنہا دیا
میری وحشت کو کچھ اور بھڑکائیگا

وقت بہہ جائیگا ، تم بھی بہہ جاؤ گی
اپنی ہر سانس 'اپنے' کو دے جاؤ گی
میری تحریر فریاد بن جائیگی
میری آواز ہونٹوں میں دب جائیگی
میرا افسانہ دنیا کے ہر موڑ پر
خالی نظروں کی دہشت سے ڈر جائیگا
جب بھی تم یاد بن کر کبھی آؤ گی
زندگی کے سفر میں کسی موڑ پر
تیرے پیکر کے سائے کا دھندلا گماں
میرے زخموں پہ پھاہا سا رکھ جائیگا
میرے قدموں کو بوجھل سا کر پائیگا
دھڑکنوں کی صدائیں تو سُن لو گی تم
پھر بھی دامن بچا کر گذر جاؤ گی
بدلے بدلے زمانے کی بدلی ہوا
کچھ نشانی تو چہروں کو دے جائیگی

ایک خدا !
ہزار خدا !

تم جنہیں کہتے ہو کافر
وہ تمہارے لئے بنے ہیں اک کتاب
تم ذرا اُسے پڑھو
تو شاید سمجھ سکو
کہ وہ لاکھوں خداؤں کو خوش رکھنے کا
کرتے ہیں جتن
اور حیف تم پہ کہ
تم اک خدا کو خوش نہیں کر پاتے

ایک بکھری داستان

برسوں کی بات نہیں
صدیاں بھی تمہیں ملتی
تب بھی تم مجھے نہ سمجھتی، نہ جانتی
کیونکہ
تم نے مجھے ہمیشہ ایک بند کتاب جان کر
پڑھنا چاہا
لیکن میں
ورق ورق بکھری اک کہانی ہوں
جسے میں خود نہیں پڑھ پایا
تمہارا دعویٰ غلط ہے
کہ تم ایک ہی نشست میں مجھے پڑھ چکی ہو
کیونکہ بکھری داستان جوڑی نہیں جاتی

تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاوں کیسے

قصہ درد ہے دنیا کو سناؤں کیسے
بہتے اشکوں کا تماشا میں دکھاؤں کیسے
چند خاکوں کے سوا اپنی حقیقت کیا ہے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

کاغذی گھر سہی، پھر بھی یہ تصور ہے حسیں
ہم نے شعلوں سے بچا رکھا ہے دامن یہ کہیں
خود ہی گھر اپنا ہواوں کو دکھاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

کروٹیں تم نے بدل کے جنہیں لکھا ہوگا
درد سے تم نے مچل کے جنہیں لکھا ہوگا
میں وہی حرف نگاہوں سے مٹاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

تپتے جذبات سے تھراتے اُن ہاتھوں کی قسم
جن سے تھاما کیا کرتے ہو کبھی اپنا قلم
تیری تنہائی کو کچھ اور بڑھاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

تیری سانسوں کی مہک لے کے جو آئے ہیں کبھی
میری ویران سی دنیا میں جو چھائے ہیں کبھی
زندگی بھر کا وہ سرمایہ گنواؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

اپنی تاریخ ہے، تہذیب ہے، تقدیر بھی ہے
اپنے اس پیار کا شاہد تو یہ کشمیر بھی ہے
ہم پہ گذری ہے جو، میں کس کو سناؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

اپنے چرچے تھے بہت، اپنا بڑا نام ہوا
جانے کس شہر میں پھر اپنا بھی نیلام ہوا
اے محبت کے خدا تجھ کو سجاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

سُرخ جوڑا تھا رنگا تیرا لہو میں گہرا
وقت نے سر پہ ہمارے بھی سجایا سہرا
دل کا لُٹنا میں تصور میں بٹھاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

کالے شہروں میں وہ سونے کا تیرا ایسا بدن
ایک خدشہ ہے کھٹکتا ہوا سینے کی چُبھن
تجھ کو ہر تیر سے، نشتر سے بچاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

اپنے ماتھے پہ لگے نام یہ اوروں کے سہی
اپنے دل میں تو کسی اور کا پیکر ہی نہیں
میں کوئی رسم جہاں اب کے نبھاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

اپنی وادی میں تو برسوں سے اندھیرا ہے صنم
خوں میں لپٹا ہوا ہر شب کا سویرا ہے صنم
دل میں اک پیار کی شمع کو بجھاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

جب تڑپتا ہوں میں راتوں کو، سُلاتے ہیں یہ خط
دور تم سے سہی پھر بھی ملاتے ہیں یہ خط
میں یہی خط کسی جہلم میں بہاؤں کیسے
تیری خوشبو میں بسے خط میں جلاؤں کیسے

خواب، میرے آنکھ کا پُر اضطراب
رات، میری بے بسی کا اک عذاب
لفظ، تیرے ہر کسی خط کا حسین
عکس، تیری یاد کا بھی پُر شباب
شوق، میرے صحن کا مُرجھا سا پھول
وصل، تیرے باغ کا مہکا گلاب
عشق، میری عقل کی اک اختراع
حسن، تیری سوچ، گم گشتہ سراب
چاند، جیسے بادلوں میں خود روبیںؔ
صبح، جیسے زاہدیؔ ہو بے نقاب

یہ گیت میں نے اور میری شریک حیات روبینہ شاہینؔ نے ۱۹۸۵ میں مشترکہ طور لکھا ہے

میں تیرے ساتھ چلونگا تیرا آنچل بن کر

زُلف تیرے جو اُڑینگے کبھی بادل بن کر
میں تیرے ساتھ چلونگا تیرا آنچل بن کر
اور جو احساس کے دامن پہ کبھی بکھرے وجود
میں سمیٹوں گا تمہیں دل کے نہاں خانوں میں
تیرے پتھر پہ کبھی جب بھی کوئی عکس ڈھلے
میں سمندر کی روانی سے بچاونگا تُجھے
پردۂ دل کو جو چھیڑے گی کبھی لہر خیال
آنکھ سے ٹپکے نہ وہ موتی ، یہ بھرم رکھ لینا
ایک آواز کا اک حرف ہوں کھو جاؤنگا
تیری غزلوں تیری نظموں میں کبھی آؤنگا
روک لینا نہ قلم تب اے صنم ، تجھ کو قسم
تیرا شیشہ ہوں جو ٹوٹا تو بکھر جاؤنگا

کاغذی تیرا دامن

ایک مدت سے میرے قلم کی یہ نِب
اپنے لفظوں کے جلتے ہوئے
خواب سے
تیرے دامن کے سائے کو یہ جان کر
اپنی آتش سے کچھ دور رکھتی رہی
کاغذی تیرا دامن ہے
جل جائے گا

حکمِ موت!

آو

ظلمت کے سیاہ پنجوں میں

جکڑی لاش کا

دیکھیں یہ منظر

لاش

جس کو

زندہ لاشوں نے دیا ہے

حکمِ موت

تاریکی

دیکھ کے اپنے شہر میں ہر سو اُجیالے کا زوال
میں نے پوچھا تنہائی میں، شب سے ایک سوال
ہم تو پہلے سے ہی لٹے تھے، سارے تھے دکھیارے
میرے وطن کو بخشے تو نے پھر کیوں یہ اندھیارے
شب کے کھلے لب، تارے چمکے، مجھ کو ملا جواب
اپنے اندر جھانک کے دیکھو، اُلٹا دو یہ نقاب
میری تاریکی پہ کیسا تیرا یہ الزام
میرے دم سے سحر کا منظر، میری سنہری شام
میری تاریکی میں روشن، جگنو، چاند، ستارے
میری تاریکی میں پنہاں، سارے گناہ تمہارے

سارے خُدا

ایک خدا کے سارے بندے
سارے بندے، ایک خدا
دُنیا کے سب گورکھ دھندے
آدم آدم سارے جُدا

کوئی من کا میلا پرائی
کوئی گیانی، سوداگر
بے دل سجدے پتھر دل کے
ہونگے بولو کیسے ادا
آدم آدم سارے جُدا

بول سبھی سچے پُستک میں
دستک در کی سوئی ہے
آوازوں کی مقتل گاہ میں
گونجے کوئی کیسے صدا
آدم آدم سارے جدا

منزل سب کی موہ اور مایا
سایا سب کے ذہنوں پر
مختارؔی کے حرص و ہوس میں
بن بیٹھے ہیں سارے خدا
آدم آدم سارے جُدا

خاموشی

آواز کا پردہ
شاید برسوں پہلے
کسی زوردار آندھی کے
سامنے
ٹھہر نہ سکا
اب گرج، گونج
گھن گھور گھٹائیں اور
گرتی ہوئی دیواروں کا شور
سنائی نہیں دیتا ——
خاموشی، قبرستان کی
کتنی بھلی لگتی ہے!

اب کے ہے انتظار خاموشی
بس سلگتے چنار خاموشی
دور تک راستہ دکھاتا ہے
ایک گرد و غبار، خاموشی
اب تو ہر گھر کا ایک ہی منظر
بند کمرہ، حصار، خاموشی
ہم تو سقراط سے بھی بڑھ کر ہیں
زہر پی کر خمار، خاموشی
پھول قبروں پہ جا کے کھلتے ہیں
اب کے اوڑھے بہار خاموشی
ایک زاہدؔ قلم کا غازی تھا
اب فقط وہ بھی یار، خاموشی

